www.urducouncil.nic.in
قیمت: -/10 ₹

آدھی آبادی کے جذبات واحساسات کا ترجمان

ماہنامہ

خواتین دنیا

Mahnama Khawateen Duniya Monthly , New Delhi

جولائی 2022

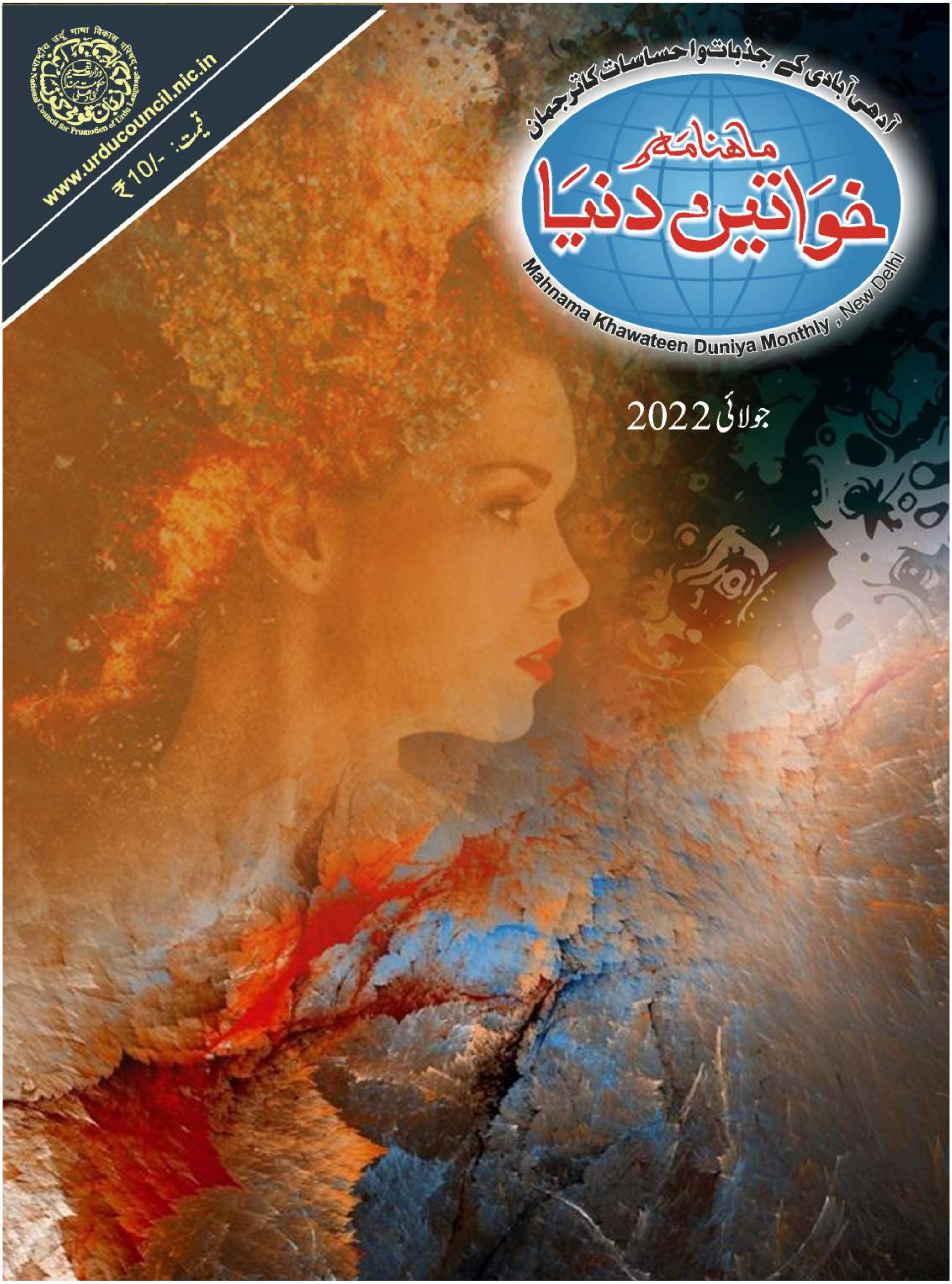

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ بچوں کی دنیا دہلی

Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں
دلچسپ کہانیاں
سائنس وٹیکنالوجی

معلوماتی مضامین
صحتِ اطفال
بچّوں کا کتب خانہ

ان کے علاوہ:

کہکشاں ◆ زبان شناسی

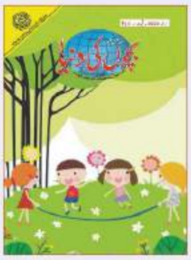

میرا بچپن ◆ بچوں کے بڑے ادیب

بچوں کی پینٹنگ ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

سب سے زیادہ چھپنے والا بچّوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ:10 روپے   سالانہ:100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

زرِتعاون سالانہ 100 روپے بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: 90092010045326 ،A/C: IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: magazines@ncpul.in

شاخ : 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 24415194 - 040

آدھی آبادی کے جذبات و احساسات کا ترجمان

ماہنامہ خواتین دنیا

Mahnama Khawateen Duniya Monthly, New Delhi

جلد: 6 شمارہ: 7 جولائی 2022

مدیر اعلیٰ : ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

مدیر منتظم : ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی

مشیر : ڈاکٹر مسرت

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان

وزارت تعلیم، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی-88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا

فیز-II، نئی دہلی- 110020

مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

قیمت -/10 روپے، سالانہ -/100 روپے

صفحات: Total Pages 64

■ قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل (NCPUL) اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

● ڈرافٹ NCPUL، New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغِ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا

جسولہ، نئی دہلی-110025، فون: 49539000

نگارشات ارسال کرنے کے لیے

ای میل: kduniya@ncpul.in

editor@ncpul.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر کے پورم، نئی دہلی- 110066

فون: 26109746، فیکس: 26108159

ای میل: sales@ncpul.in

شاخ: 22-7-110، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس

بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدر آباد-500002

فون: 24415194 - 040

اس شمارے میں

اداریہ	مشعل	مدیر	4
شخصیت	افسر النسا افسر: ایک نسائی مگر بلند و بالا آواز	ڈاکٹر محمد کلیم ضیا	5
نکہت سخن	شاعرات کے منتخب اشعار		8
جہان نسواں	فکر تونسوی: بحیثیت طنز نگار	میمونہ علی چوگلے	9
	زاہدہ زیدی کی ڈراما نگاری	ڈاکٹر شاذیہ عمیر	13
	احمر لکھنوی بہ حیثیت غزل گو	سیدہ جنیفر رضوی	17
	ادب اطفال کا نسائی اظہار	عائشہ ضیا	22
	نصرت آرا چودھری بحیثیت شاعرہ	بشیر شاہین	28
	ڈاکٹر عندلیب شادانی کی شعری کائنات	زرین فاطمہ	32
حسن سخن	شہناز فاطمہ صدیقی، شبانہ عشرت		36
افسانہ	آؤ! اب لوٹ چلیں	ڈاکٹر شمیم صادقہ	38
	درد آشنا	ڈاکٹر نغمہ جاوید ملک	41
	فیس بک سے واٹس ایپ تک	محمودہ قریشی	46
باورچی خانہ	لذیذ پکوان		53
صحت	نزف الدم بعد سن یاس	ڈاکٹر احسان رؤف	55
آرائش و زیبائش			58
تاثرات	تاثرات نگر نگر سے		60
خواتین خبرنامہ			61

مشعل

فکشن ہو یا شاعری خواتین نے ہر میدان میں انمٹ نقوش چھوڑے ہیں یہ الگ بات ہے کہ خواتین کی کاوشوں کا اعتراف بہت بعد میں کیا گیا۔ نظر انداز کیے جانے کے باوجود بھی خواتین نے اپنے حوصلے اور ہمت کو کبھی پست نہیں ہونے دیا۔ شروع میں نہ خواتین اپنے نام سے لکھتی تھیں اور نہ ہی خواتین کے بارے میں لکھا جاتا تھا لیکن رفتہ رفتہ صورت حال تبدیل ہوئی تو خواتین کے تذکرے بھی منظر عام پر آنے لگے۔ خاتون شاعرات کا سب سے پہلا تذکرہ بہارستان ناز کے نام سے حکیم فصیح الدین گنج میرٹھی نے تحریر کیا تھا۔ جس کے پہلے ایڈیشن میں 70 شاعرات کا ذکر تھا۔ تیسرے ایڈیشن میں اضافہ ہوا تو 174 شاعرات کی شمولیت ہوئی اس کے بعد مزید تذکروں کی اشاعت کا آغاز ہوا۔ جن میں عبدالحئی صفا بدایونی کا 'شمیم سخن' قابل ذکر ہے۔ جس میں 151 شاعرات کا ذکر ہے اس ضمن میں درگا پرساد نادر دہلوی کا ذکر بطور خاص کیا جاسکتا ہے کہ انھوں نے ایک مختصر تذکرہ 'گلشن ناز' کے نام سے تحریر کیا۔ 'چمن انداز' کے نام سے دوسرا تذکرہ شائع ہوا۔ اس کے بعد 'تذکرۃ النسائے نادری' کے نام سے ایک اور تذکرہ شائع ہوا جس میں اردو اور فارسی شاعرات کا تفصیلی ذکر موجود ہے۔ جمیل احمد کی کتاب بھی 'تذکرہ شاعرات اردو' کے عنوان سے شائع ہوئی۔ ان تذکروں سے یہ پتہ چلتا ہے کہ شعر و ادب کے میدان میں خواتین کی ایک بڑی تعداد متحرک اور فعال رہی ہے اور بہت سے رسائل شائع ہوئے ہیں جن سے خواتین کو تحریک و ترغیب ملی۔ ایک زمانہ تھا جب شعرا کے تذکرے لکھے جاتے تھے تو اس میں کسی بھی خاتون کا ذکر شامل نہیں ہوتا تھا۔ میر کے 'نکات شعرا' اور قائم چاند پوری کے 'مخزن نکات' میں کسی بھی خاتون کا تذکرہ شامل نہیں ہے۔ اس طرح دیکھا جائے تو مذکورہ بالا تذکرے کافی اہمیت اور معنویت کے حامل ہیں اور حقیقت یہی ہے کہ خاتون کی اچھی خاصی تعداد ہے جن کا شعر و ادب سے گہرا رشتہ رہا ہے۔ نصیر الدین ہاشمی کی ایک کتاب 'حیدرآباد کی نسوانی دنیا' کے عنوان سے ہے۔ جس میں پانچ سو شاعرات کا ذکر ہے۔ اسی طرح فصیح الدین بلخی 'تذکرہ نسوان ہند' سے اندازہ ہوتا ہے کہ مختلف میدانوں میں خواتین نے اپنی عظمت و رفعتوں کے پرچم لہرائے ہیں۔ ان کے علاوہ خواتین کے بہت سے تذکرے لکھے گئے۔ اب خواتین پر مرکوز بہت سی کتابیں اور رسائل شائع ہو رہے ہیں جو خوش آئند ہے اور خواتین کے تعلق سے جو ناانصافی کی شکایتیں ہیں ان کا ازالہ ہو رہا ہے۔ ماضی میں خواتین نے اپنی نگارشات سے ایک بڑے حلقے کو متاثر کیا ہے۔ قدیم نسائی رسائل میں ان کی تخلیقات کا موجود ہونا نئے عہد کی قلم کار خواتین کے لیے بہت اہم ہے۔

آپ کا

عقیل احمد

ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

ڈاکٹر محمد کلیم ضیا

افسر النساء افسر

ایک نسائی مگر بلند و بالا آواز

(''پسِ پردہ'' کے حوالے سے)

زمانۂ قدیم سے ہی صنفِ شاعری میں خواتین کا ایک مقام رہا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ مردوں کی اجارہ داری اور عورتوں کو صنفِ نازک کا خطاب عطا کر دینے کے بعد صرف ان کے لطیف و نازک جذبات کا استحصال کیا جاتا رہا ہے مگر شعر و ادب پر بہر حال مردوں کا ہی سکہ چلتا رہا۔ پورے ادب میں جن کا نام نمایاں طور پر جانا جاتا ہے وہ ذاتِ مرد ہی ہے۔ عورت کو ہمیشہ حاشیہ پر رکھا گیا لیکن ان تمام قیود، پابندیوں، جکڑ بندیوں، زنجیروں اور بیڑیوں کے بلکہ تعصّبات کے باوجود ان کا فن نمایاں ہوا اور نہ صرف انھوں نے ادب میں اپنا مقام بنایا بلکہ اپنے فن کو تسلیم بھی کروایا۔ یہ بھی مردوں کے ظرف ہی کا معاملہ ہے کہ وہ داد و تحسین میں بھی بخل کا دامن ہاتھ سے جانے نہیں دیتے، اعتراف تو بہت دور کی بات ہے۔

عرب کی سب سے بڑی شعری صنف مرثیہ گوئی رہی ہے کیوں کہ زمانۂ جاہلیت میں عرب قبائل کے درمیان ہمیشہ کش مکش اور جنگیں ہوتی رہی ہیں جن کے نتیجے میں ہزاروں مرد مارے جاتے، عورتیں اور بچے غلام بنا لیے جاتے اس طرح زندگی غموں کا گہوارہ بن جاتی۔ ایسی صورت میں اپنے جذبات اور احساسات کا اظہار شاعری کے ذریعے ہی ہو پاتا تھا۔ جو بچ جاتے ان کے دلوں میں جذبۂ انتقام شد و مد کے ساتھ پرورش پاتا تھا۔ وہ اپنے نوجوانوں اور زندہ بچ رہنے والے مردوں کو جوش دلانے کے لیے اشعار کہتے، جن میں اپنے قبیلے کی بڑائی، اپنے جوانوں کی شجاعت، دشمن کو حقیر گردانتے اور انتقام لینے کے جذبات کوٹ کوٹ کر بھرے ہوتے، اسی میں اپنے مقتول رشتہ داروں کا گریہ و ماتم ہوتا اور جوانوں میں انتقام کے جذبات بھڑکائے جاتے۔ ان حالات نے گھر گھر اور قبیلہ قبیلہ ایسے افراد پیدا کر دیے تھے جو مرثیہ کہتے، محلوں، بازاروں، میلوں ٹھیلوں اور حج کے ایام میں عوام کو سناتے۔ یہ فن ان کے اندر اس قدر پروان چڑھ چکا تھا کہ دنیا ان کے جیسا فصیح و بلیغ کلام پیش کرنے سے قاصر تھی۔ ویسے بھی عرب دوسروں کو 'عجمی' کہتے تھے یعنی 'جاہل' یا 'گونگا'۔ یہ فن اپنے عروج پر ان کے یہاں پہنچ چکا تھا۔ زمانۂ امن میں، جس طرح ہمارے ملک میں مشاعرے ہوتے ہیں وہاں بازار کے دنوں یا میلوں میں لوگ اکٹھا ہوتے، مرثیہ سناتے اور عوام سے داد و دولت وصول کرتے۔ ایک سے بڑھ کر ایک شاعر فصاحت و بلاغت کا نمونہ ہوتا۔ البتہ ان سب کو اپنے فن پر اگر کسی نے چیلنج کیا ہے تو وہ ذات ایک عورت کی تھی جسے عربوں نے ''ارثی العرب'' کے خطاب سے نوازا۔

ہند و پاک میں خواتین نے ادب کی جو خدمات انجام دیں ہیں ان میں افسانہ نگاری۔ ناول نگاری اور خصوصاً رومانی ناولوں میں عورتوں کا مقام نمایاں رہا ہے۔ مثلاً عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر اور رضیہ بٹ وغیرہ کی خدمات کو سراہا گیا اور انھیں سند بھی عطا کی گی۔ شعری ادب میں جو نام نظر آتے ہیں ان میں ادا جعفری، پروین شاکرہ، رفیعہ شبنم عابدی، زاہدہ حنا، فہمیدہ ریاض، زاہد زیدی، ساجدہ زیدی، زہرہ نگاہ اور کشور ناہید وغیرہ نمایاں ہیں لیکن یہ تو صرف چند نام ہیں جن کا چرچہ ہے ورنہ خاکستر میں دبی

چنگاریاں بے شمار ہیں جن کا احاطہ نہ صرف مشکل ہے بلکہ یہاں اس کی گنجائش بھی کم ہے۔

میں ایسی ہی ایک شاعرہ کو متعارف کرانے جا رہا ہوں جو پردۂ شہود پر تو اب تک نہ آسکی مگر جس کی شعری تخلیقات نے اسے اس قابل بنا دیا کہ اس کے کلام پر کچھ نہ کچھ ضرور کہا جا سکے۔ وہ نام ہے افسر انساء افسر کا۔ ان کا تعلق مہاراشٹر کے مردم خیز علاقے اورنگ آباد سے ہے جہاں عرصہ سے علما، مشائخ، شعرا اور ادبا کی نہ صرف بہتات رہی ہے بلکہ ان کے کارہائے نمایاں نے اس علاقے کو آس پاس کے دیگر علاقوں پر تفوق عطا کر دیا۔

افسر انساء افسر غزل گو شاعرہ ہیں۔ ان کا مجموعہ کلام 'پسِ پردہ' میں بیش تر غزلیں ہیں سوائے، حمد، نعت اور دو نظموں کے جیسا کہ مجموعۂ کلام کے نام سے ہی عیاں ہوتا ہے کہ جو کچھ انھوں نے لکھا پسِ پردہ ہی لکھا وہ منظرِ عام پر نہ آسکا، البتہ پورے کلام میں ایک مرکزی نظریہ کارفرما نظر آتا ہے جو افسر کے پاکیزہ خیالات کا غماز ہے۔

غزل نام ہے صنفِ نازک سے کلام کرنے کا لیکن اس میں یہ بھی پوشیدہ ہے کہ جب صنفِ نازک سے کلام کیا جائے گا تو وہ خاموشی سے صرف سنتی ہی نہیں رہے گی بلکہ وہ بھی اپنے جذبات کا کسی نہ کسی سطح پر اظہار ضرور کرے گی۔ مگر اس بات کو کلی طور پر نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ بلکہ اگر اس نے کچھ کہا بھی تو اسے اخفا میں رکھا گیا یا اس کی زبان پر قفل لگا دیے گئے ایسے میں روبرو نہ سہی پسِ پردہ ہی جواب دینے کا حوصلہ اپنے اندر بڑی جرأت اور ہمت کا کام ہے۔ اس کو افسر نے نہ صرف محسوس کیا بلکہ برملا اس کا اظہار بھی کیا۔ وہ کہتی ہیں:

بڑھ سکی نہ آگے افسر دو قدم
پاؤں میں کچھ بیڑیاں ایسی ہی تھیں

افسر نے بھی غزلوں کو غزلوں کا رنگ دیا۔ ان کے اشعار میں فکر کی گہرائی اور ادب کی چاشنی کو واضح طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔ الفاظ سہل مگر موتیوں کی طرح استعمال کیے گئے ہیں جس کی وجہ سے اردو کا وقار بھی بحال رہا اور دل میں اتر جانے والے جذبات و احساسات بھی موجود رہے۔

جب مصیبت سے یا آلام سے گھبراتے ہیں
ہم خیالوں کے سمندر میں اُتر جاتے ہیں

ان کے اشعار میں خیالات کی پاکیزگی کے ساتھ ساتھ غزل کے لوازمات بھی اپنی آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔ علاوہ ازیں انھوں نے صنفِ نازک کے جذبات کی فہرست بہت قرینے سے سجائی ہے۔ ایسی نسائی صدائیں جو کواڑوں کی دراڑوں سے بھی باہر نہیں آسکتیں وہ چہار دیواری میں قیامت تو برپا کر سکتی ہیں۔۔۔۔۔۔۔ ہاں یہ آوازیں اور تھوڑی بلند ہو جائیں تو یہ دراڑوں کو کیا آسمانوں کو چیر سکتی ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں:

آئی جو یادِ ماضی تو آنسو نکل گئے
پلکوں پہ آکے چند ستارے مچل گئے
آپ کے ساتھ ہوئیں ہم سے بہاریں رخصت
قافلے اب تو خزاؤں کے ہی گھر آتے ہیں
حالِ دل اپنا بھلا کس کو سنائیں افسر
مختصر یہ ہے کہ مر مر کے جیے جاتے ہیں
کر کے وفا بھی کیا ملا ہم کو کسی کے ساتھ
ہر وقت ہم ستائے گئے سادگی کے ساتھ
شکوہ رہا لبوں پہ شکایت نہ سرد آہ
پلکوں سے چند موتی گرے بے بسی کے ساتھ

ان اشعار میں نہ جذبات کا بھونڈا اظہار ہے نہ کسی قسم کی اشتہا اور نہ ہی جنسی تلذذ کی نمایش البتہ ایک عورت کے لطیف جذبات کی پاکیزہ ترجمانی اور اس کی بے بسی ہے۔ بلکہ ہر دو طرح بظاہر اور بہ باطن مردوں کے جذبۂ احساسِ کم تری کی نشاندہی بھی موجود ہے۔ افسر نے اپنے اشعار کو ایک مرکزیت عطا کی ہے۔ ان کے اندر خوفِ آخرت اور اللہ کے حضور پیشی، دنیا کی چند روزہ زندگی اور موت نے ایک عنوان عطا کر دیا ہے اور وہ ہر وقت اسی کی فکر میں لگی رہتی ہیں۔ لہٰذا وہ اوروں کو بھی اس طرف راغب کرتی ہیں کہ انسان ہر وقت اس بات کو محسوس کرتا رہے کہ وہ یہاں مستقل قیام کے لیے نہیں آیا ہے بلکہ اسے ایک نہ ایک دن واپس جانا ہے۔ یہاں اس کا قیام عارضی ہے وہ یہاں آتا ہے کچھ پل ٹھہرتا ہے، آرام کرتا ہے اور ایک مسافر کی طرح آگے بڑھ جاتا ہے۔ وہ اس خیال کو مختلف پیراؤں میں تکرار کے ساتھ پیش کرتی ہیں۔ یہی ان کے مجموعۂ کلام کا خصوصی رنگ ہے جس نے حقیقی معنوں میں ان کے کلام کو صوفیانہ بنا دیا ہے اور عشق کو عشقِ حقیقی سے جوڑ دیا ہے۔ اشعار ملاحظہ فرمائیں:

کون رُکتا ہے کیسے روک سکا ہے کوئی
جانے والے تو بہر حال چلے جاتے ہیں
درسِ عبرت ہے جہاں اہلِ بصیرت کے لیے
لوگ آتے ہیں ٹھہرتے ہیں چلے جاتے ہیں

دشواریوں نے راہ میں الجھا لیا ہمیں
جو ہم سفر تھے اپنے وہ آگے نکل گئے
افسر کسے ملی ہے بقا اس جہان میں
جتنے بھی آئے دم لیے،ٹھہرے ،نکل گئے
جانا ہے سب کو ایک دن جس جا سے سب ہیں آئے
اچھی طرح سمجھ لو کہ دنیا ہے اک سرائے
رب کا دستور یوں بھی جاری ہے
''آج وہ ،کل ہمارہ باری ہے''
جس پہ دنیا کو رشک آئے گا
میں نے وہ زندگی گزاری ہے

مردوں کے اشاروں پر ناچنے والی یہ دنیا جس نے کبھی صنفِ نازک کو''عورت'' رہنے نہ دیا۔ بلکہ اسے کبھی دیوی تو کبھی ذلت کی مورت بنا کر پیش کیا۔مگر درمیان میں جو کہ سچ مچ اس کا صحیح مقام ہے کم ہی اسے عطا کیا گیا۔ان ڈھکوسلے بازیوں سے افسر بخوبی واقف ہیں۔صنفِ نازک پر الزامات اور بہتانات کے درمیان اداجعفری نے مردوں پر طنز کرتے ہوئے کہا تھا کہ:

صدیوں سے مرے پاؤں میں ہے جنتِ انساں
اور میں انسان سے جنت کا پتا پوچھ رہی ہوں

رفیعہ شبنم عابدی نے بھی کہ تھا کہ:

جنت سے نکلوانے کا الزام نہ دینا
جنت جسے کہتے ہیں مرے زیر قدم ہے

مذکورہ بالا قسم کے خیالات افسر کے یہاں شاید اس لیے نہیں ملتے کہ ان کی پرورش و پرداخت یقیناً مثبت طریقے سے ہوئی ہے۔وہ تو امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے علَم کے ساتھ زندگی گزارتی رہیں۔یہی وجہ ہے کہ ان کا پورا کلام دنیا کی بے رغبتی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔موت برحق ہے اور سبھی کو اس کا ادراک ہے کہ دنیا میں چاہے جتنی عمر جی لیں ایک نہ ایک دن تو موت کا فرشتہ آئے گا اور اٹھا لے جائے گا۔فکرِ ممات نے افسر کو بھی بے چین رکھا اس لیے ان کے قلم سے بار بار یہ دعائیں نکلیں کہ آخرت میں ان کا بیڑا پار ہو جائے،ان کی مغفرت ہو جائے۔اسی فکر کو انھوں نے اپنی غزلوں کے ذریعے لوگوں تک پہنچانے کی کوشش بھی کی۔

لب پہ ذکرِ خدا،دمِ آخر
اور قصہ تمام ہوجائے

وہ مسلسل دعا کے ساتھ نصیحت بھی کرتی ہیں کہ:

اعمال نیک کر لو ممکن ہو تم جہاں تک
یہ مال و زر وہاں پر کچھ بھی نہ کام آئے
بخشش ہماری کرنا عاصی ہیں ہم خدایا
رحم و کرم کی تیرے ہیں آس ہم لگائے
یا رب عطا تو کرنا توفیق ہر بشر کو
حالت نزع میں کلمہ سب کی زباں پہ آئے
کرتی یہی دعا ہے افسر خدا سے ہر دم
سجدے میں سر ہو میرا جس وقت موت آئے
لرزہ اندام ہوں میں سرتاپا
دل میں خوفِ خدا جو طاری ہے

ہر نیک شخص تمام تر تمناؤں کے ساتھ ایک بڑی تمنا یہ بھی رکھتا ہے کہ اسے بروزِ محشر مخلوقِ خدا کے سامنے ذلیل وخوار نہ ہونا پڑے بلکہ اعلا مرتبت لوگوں میں اس کا شمار ہو۔اسی دلی آرزو کا اظہار افسر بھی کرتی ہیں:

ہے آرزو یہی مری میدانِ حشر میں
میں بھی پکاری جاؤں وہاں بندگی کے ساتھ

ان کی شاعری کا حاصل یہی ہے کہ وہ آخرت میں سُرخ رو ہوں لہٰذا انھوں نے اپنے جذبات کی ترجمانی بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ مگر پسِ پردہ رہ کر ہی کی ہے اور اسی جذبے نے ان کے کلام کو عشقِ حقیقی سے مربوط و منسلک کر دیا ہے۔دعا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ ان کی دِلی تمنا کو پورا کرے،ان کا کلام ان کے دفترِ اعمال میں اجر کا ذریعہ بنے اور ان کی رہ نمائی سے انسانیت کو سرفراز کرے۔آمین۔

□□□

Dr.Mohammed Kaleem Zia
HOD, Dept. of Urdu
Government of Maharshtra's Ismail Yusuf College,
Jogeshwari (East)
Mumbai –400 060 (M.S.)
Cell: +919892933626 / +919820786854

شاعرات کے منتخب اشعار

میں دشمنوں کی شکایت کا حق نہیں رکھتی
کہ دوستوں ہی نے کب پیار کا بھرم رکھا

یہ سرکشی، یہ بغاوت مرا سرشت نہ تھی
بہت ستایا جہاں نے تو میں نے منھ کھولا

ناہید اختر

اسے یہ ضد تھی کہ ہر سانس اس کی خاطر ہو
مگر مجھے تو زمانے کے ساتھ جینا تھا

مرضی سے اپنی بس یوں ہی دو سانس کے لیے
تھوڑا سا حوصلہ تھا کوئی سرکشی نہ تھی

رفیعہ شبنم عابدی

ہماری بے بسی شہروں کی دیواروں پہ چپکی ہے
ہمیں ڈھونڈے گی کل دنیا پرانے اشتہاروں میں

کسی کو کیا خبر ہم اپنی پیدائش سے گونگے ہیں
ہماری زندگی کٹتی ہے اوروں کی زباں ہو کر

وفا لکھنوی

اپنے حالات کی تصویر ہے نقش ہستی
آئینہ دیکھ کے لازم نہیں حیراں ہونا

اس بھری دنیا میں اب تو کوئی بھی اپنا نہیں
جیسے تم ہر درد کا رشتہ اٹھا کر لے گئے

سیدہ شان معراج

حدود عرصہ گہہ ذات سے گزر جائیں
خلا میں دور بہت دور تک بکھر جائیں

تلاش منزل خوشبو کی راہ میں شبنم
نہ جانے کتنی بہاروں کے خواب مر جائیں

صدیقہ شبنم

دانستہ اپنے آپ سے لپٹے ہوئے ہیں لوگ
تنہائیوں کا درد بھی اب کس کو راس ہے

یہ زندگی تو مسلسل سفر ہے چلنا ہے
تمام عمر چراغوں کی طرح جلنا ہے

مظفر النساء ناز

گو جشن دید فصل بہاراں بہت ہوئے
سیما مگر یقین بہاراں نہ ہو سکا

وہ لوگ جو ڈرتے تھے کبھی موج بلا سے
اب دیر سے طوفاں کی دعا مانگ رہے ہیں

سیما نظمی

زمیں کی ہم سخنی، قسمت صبا بھی نہیں
رہیں کہاں کہ یہاں معتبر ہوا بھی نہیں

غم و ملال کے آنگن میں پیر جلتے ہیں
جھلس کے جائیں کہاں کوئے بے ادا بھی نہیں

کشور ناہید

میمونہ علی چوگلے

فکر تونسوی بحیثیت طنز نگار

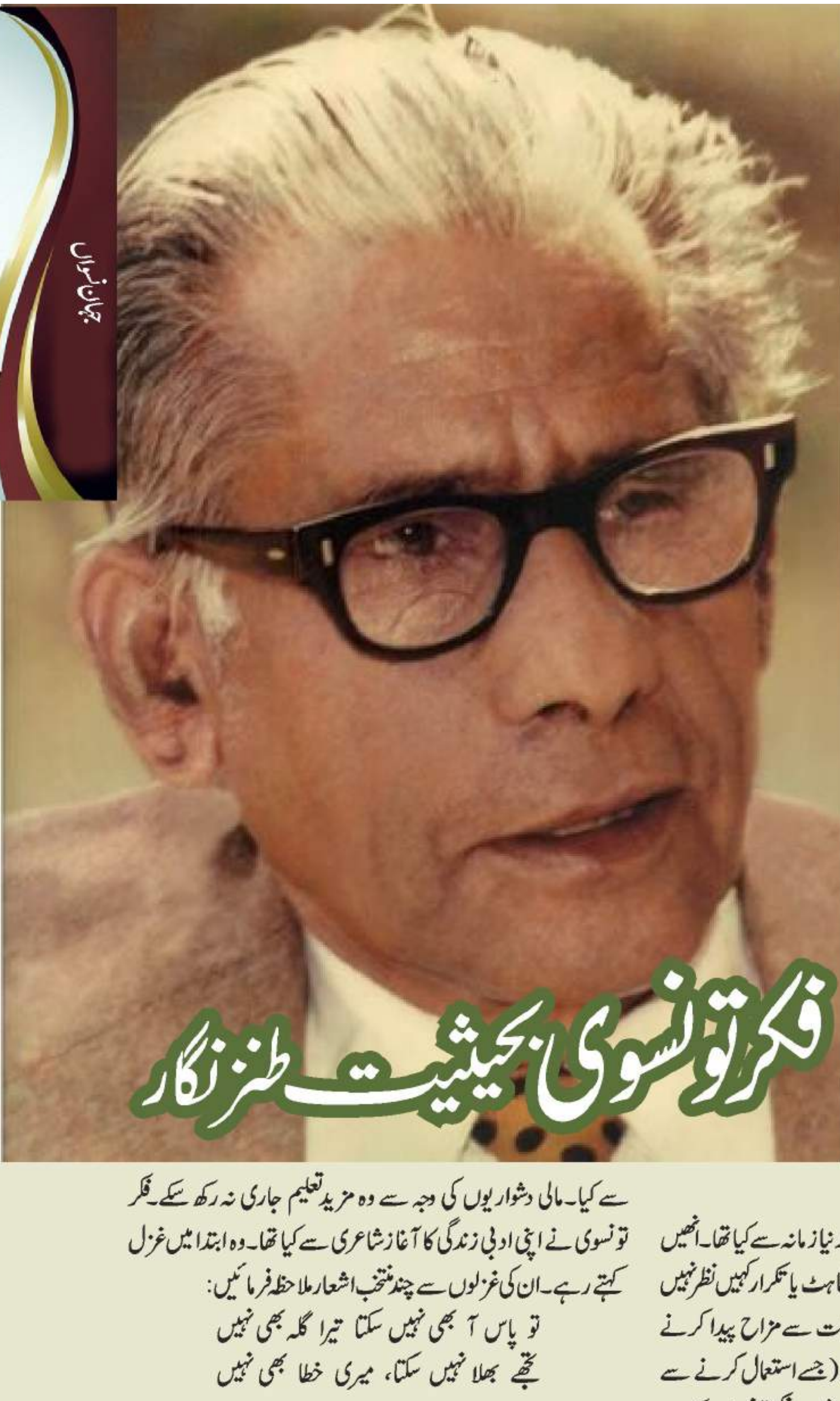

ہماری زندگی میں طنز و مزاح کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔طنز ہمارے معاشرے میں پھیلی ہوئی برائیوں کو دور کرنے کا کام کرتا ہے اور مزاح ہماری زندگی میں مسکراہٹ بکھیرتا ہے۔ جو لوگ آزادی کے بعد طنزیہ و مزاحیہ ادب کی پہچان بنے، ان میں فکر تونسوی کا نام خاصا نمایاں ہے۔ان کا کالم ''پیاز کے چھلکے'' 1956 سے 1987 روزنامہ ملاپ میں باقاعدگی کے ساتھ شائع ہوتا رہا۔

انھوں نے کالم نگاری کا آغاز 1952 میں اخبار نیا زمانہ سے کیا تھا۔انھیں روزانہ کالم لکھنا ہوتا لیکن ان کے کالم میں اُکتاہٹ یا تکرار کہیں نظر نہیں آتی۔یہ عام بول چال کے الفاظ اور اصطلاحات سے مزاح پیدا کرنے میں ماہر تھے۔ان کا اصل نام رام نرائن بھاٹیہ (جسے استعمال کرنے سے گریز کرتے رہے) تھا۔انھیں اردو ادب میں شہرت فکر تونسوی کے نام سے ملی۔ان کا آبائی تعلق تونسہ ضلع غازی خان سے تھا۔تاہم ان کی ولادت 7 اکتوبر 1918 کو شمس آباد ضلع ملتان میں ہوئی تھی ,جہاں ان کے والد دھنپت رائے طب اور تجارت کے پیشے سے وابستہ تھے۔ان کی میٹرک تک تعلیم تونسہ میں ہوئی جب کہ بی۔اے (سال اوّل) ایمرسن کالج ملتان سے کیا۔مالی دشواریوں کی وجہ سے وہ مزید تعلیم جاری نہ رکھ سکے۔فکر تونسوی نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے کیا تھا۔وہ ابتدا میں غزل کہتے رہے۔ان کی غزلوں سے چند منتخب اشعار ملاحظہ فرمائیں:

تو پاس آ بھی نہیں سکتا تیرا گلہ بھی نہیں
تجھے بھلا نہیں سکتا، میری خطا بھی نہیں

بنا چکا میری تقدیر کے جب وہ نقشے
نہ جانے رو دیا کیوں مجھ پہ نقش کار میرا

بعد ازاں فکر تونسوی صاحب نظم گوئی کی طرف متوجہ ہوئے۔ان کی تمنا یہی تھی کہ وہ بڑے شاعر بنیں۔ان کی نظمیں '' ادبِ لطیف''،

''ہمایوں''اور ادبی دنیا میں شائع ہوتی رہیں بہ قول کشمیری لال ذاکر:

''میں فکر تونسوی کو ایک بڑا شاعر مانتا ہوں، جس کے پاس اسلوب، موضوع کی وسعت، ڈکشن اور سینسی ٹی وٹی (Sensitivity) کی فراوانی، بات کہنے کا حوصلہ اور جرأت ہے۔ ہر شاعر طنز نگار نہیں ہو سکتا کیوں کہ ہر شاعر میں اپنی بات کہنے کی جرأت نہیں ہوتی۔''

کنہیا لال کپور کہتے ہیں:

''فکر کی شاعری، دل کی نہیں دماغ کی شاعری ہے۔ اس لیے اس کی شاعری سیدھی دل میں نہیں اترتی، دماغ کو جھنجھوڑتی ہے۔ اس کی شاعری میں جو ایک مفکّرانہ انداز ہے، وہ شاعروں کے ضمن میں آنے نہیں دیتا۔ فکر شاعری کو تفریح کا ذریعہ نہیں سمجھ سکا اور اس میدان کو چھوڑ گیا۔''

فکر تونسوی کی مختصر سی نظم ''شکنتلا'' بڑے زوردار انداز میں کہی گئی ہے، جو سماجی قوانین پر بھرپور طنز ہے اور عورت کی حمایت میں بھرپور تاثر پیش کرتی ہے:

اسے دیوار میں چن دو، اسے سنگسار کر دو
اسے نیزوں پہ بچھا دو، اسے چھلنی کر دو
دھڑ دھڑاتے ہوئے شعلوں میں جھلس دو اس کو
ہڈیاں پیس دو، کتّوں سے اسے نچوا دو!
اس نے توہینِ شہنشاہِ معظم کی ہے
ایک ذرّے نے تمنائے دو عالم کی ہے

فکر دھیمے انداز کا شاعر نہیں، وہ تو بھرپور انداز میں وار کرنا چاہتا ہے اور اسی لیے ایسے الفاظ انتخاب کرتا ہے کہ بس اس کا طنز زیادہ تیکھا، زیادہ مؤثر ہو۔ اس کی شاعری میں دھیما اور نرم لہجہ نہیں ملے گا۔ وہ عشق و محبت، حسن و جمال کا نہیں بلکہ وہ تو طنز کا شاعر ہے۔ یہی اس کے فن کی جان ہے۔ وہ پیار پر بھی طنز ہی کرسکتا ہے اس کی پرستش نہیں:

کیوں نہ پھر وقت کی سرحد سے ذرا ہٹ کے چلیں
آ! ذرا پیار کریں، دل و جاں کا سنگھار کریں
اس سے پہلے کہ ڈھلک جائے یہ اُمید کی لو
اور بنیں ہم کسی آئندہ اندھیرے کا شکار

ان کا شعری مجموعے ''ہیولے'' کی نظم ''مہا گیانی'' ہندوستانی سماج کی مکمل تصویر ہے۔ طنزیہ شاعری میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ انھیں طنزیہ شاعر ماننے کے لیے یہی ایک نظم کافی ہے۔ اس میں ان کی سوچ کے مختلف پہلو اجاگر ہوئے ہیں۔ ان کی نظمیں عالمی سطح کے رسائل میں مثلاً ''ادبِ لطیف''، ''ہمایوں''، ''ادبی دنیا'' وغیرہ میں شائع ہوتی تھیں۔ 1941 میں ممتاز مفتی کے اشتراک سے ایک دو ماہی رسالہ ''سویرا'' جاری کیا۔ 1946 میں ''ادبِ لطیف'' سے بہ حیثیت مدیر منسلک رہے۔ 1947 میں ان کی اوّلین شعری تخلیق ''ہیولے'' شائع ہوئی لیکن فرقہ وارانہ فسادات کے باعث مقبول نہ ہو سکی۔ ان کی نظمیں عمیق گہرائی رکھتی ہیں اور شاید اس لیے بھی عام قاری کی فہم و فراست سے بالاتر تھیں۔ قارئین کے علاوہ ناقدین نے بھی ان کی شاعری کو قابلِ توجہ نہیں سمجھا۔ کہیں برسوں بعد اردو ادب کے شائقین یہ بات سمجھ سکے کہ طنز تو ان کی نظموں میں بھی تھا۔ بعد ازاں انھوں نے شاعری ترک کر دی اور طنز کے لیے نثر کا اختیار کیا، جس میں انھوں نے ناقابلِ فراموش نقوش چھوڑے۔ وہ خود کہتے ہیں:

''میں عوام کا فنکار تھا، عوام اگر شاعری کی بجائے نثر سمجھتے ہیں تو عوام کا رائٹر نثر لکھے گا۔ ادب وہی عظیم ہوتا ہے، جو عوام کا ترجمان بن جائے۔''

طنز نگاری فکر تونسوی کا شغل نہیں اوڑھنا بچھونا ہے۔ جدید ادب میں جیسا فکر تونسوی نے لکھا، شاید ہی کسی ادیب نے اس خوش اسلوبی سے فرسودہ روایات اور بے ہودہ اشخاص کو بے نقاب کیا ہوگا۔ ان کا پختہ سماجی شعور اور دل آویز اسلوبِ بیاں نہ صرف طنز نگاری کی تلخی کو گوارا بنا دیتا ہے بلکہ قاری کے مزاج پر گراں بھی نہیں گزرتا۔ فکر تونسوی نے طنز سے تازیانے کا کام لیا ہے۔ طنز ان کے نزدیک اصلاح کا حربہ بھی ہے اور انتقام کا بھی۔ وہ اپنے طنز کی تلوار کی دھار پر مروت کا موضوع یا مصلحت کا رنگ نہیں جمنے دیتے۔ فکر تونسوی سماج کے نمائندوں اور ان کی اقدار سے کسی طرح کا بھی سمجھوتا کرنے کو تیار نہیں۔ ان کے طنز میں جو جارحیت ہے، وہ ان کے عہد کے طنز نگاروں میں کم ہی دکھائی دیتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فکر کا طنز وہم و یقیں کے دھندلکے میں جنم نہیں لیتا وہ مثبت روّیے میں فروغ پاتا ہے۔

طنز و ظرافت اکثر ساتھ ساتھ استعمال ہوتے ہیں۔ عام طور پر ان دونوں میں کوئی فرق نہیں سمجھا جاتا کیوں کہ کوئی مضمون طنز پر جامع نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس میں ظرافت کا رنگ شامل نہ ہو۔ طنز میں تلخی اور شدت ہے، اس لیے ادب میں اس کے لیے خاص اسالیب اختیار کیے جاتے ہیں۔ طنز کی کڑوی گولی لطف و چاشنی کی مدد سے حلق سے اُتاری گئی ہے۔ طنز کا نشتر مزاح کے زیر اثر قاری پر ایک نیم شگفتہ حالت میں خاموشی کے ساتھ اپنا کام کر جاتا ہے۔ طنز کی شدت، تیزی اور تلخی ایک اچھے اور بڑے مقصد کے لیے ہوتی ہے اور فکر تونسوی کا طنز مقصدیت لیے ہوتا

ہے۔کامیاب ظرافت وہ ہے جو ہنسائے لیکن فکر کو بیدار بھی کرے۔ ظریفانہ ادب زندگی کے بے ہنگم عکس کو، زندگی کے دکھ درد کو اپنے اندر سمو کر بھی نشتر زنی کرتا ہے تو کبھی مزاح کے پھاہوں سے زخم بھرنے کی کوشش کرتا ہے۔فکر تونسوی کو ہم بجا طور پر طنز نگار کہہ سکتے ہیں کیوں کہ ان کی نگاہیں سماج کے ہر کردار اور سماج کی ہر برائی پر ٹکی رہتی تھیں۔شوکت تھانوی، رشید احمد صدیقی، پطرس بخاری، عظیم بیگ چغتائی اور ان کے معاصرین کے ہاں طنز و مزاح کی جھلکیاں کچھ اور نکھری ہوئی صورت میں ملتی ہیں۔آزادی کے بعد جو لہو رنگ مناظر دیکھنے کو ملے، ان سے ادبا سوچنے پر مجبور ہوئے اور قلم کاروں کی تحریروں میں سنجیدگی اور درد نے جگہ بنالی۔اسلوب میں مزاح کے ساتھ درد مندی کے احساسات اور انداز شامل ہو گئے اور ان کی تخلیقات طنز و مزاح کے اعلیٰ معیار تک پہنچ گئیں۔اُس دور کے مزاح میں طنز کی نشتر زنی بڑی کارگر صورت میں ملتی ہے۔کرشن چندر، کنہیا لال کپور، ابراہیم جلیس، مجتبیٰ حسین، یوسف ناظم اور فکر تونسوی کے نام اس سلسلے کی بڑی مثالیں ہیں۔فکر تونسوی کا فنِ طنز و مزاح تخلیقی ہنر سے آشنا نظر آتا ہے۔انھوں نے نصف صدی تک بہ حیثیت ادیب، صحافی، نقاد، شاعر، کالم نگار اور طنز نگار اردو اور عوام کی قلمی خدمت کی۔

یوں تو اردو میں اَن گنت مزاح نگار اور طنز نگار اور کالم نگار بے شمار گزرے ہیں لیکن جن کی تحریریں ادب کے زمرے میں شامل ہوئیں، وہ بہت کم ہیں۔ان معدودے چند ادیبوں میں فکر تونسوی کا نام بھی شامل ہے، جو کبھی فراموش نہیں ہو گا کیوں کہ ان کی تحریریں سوچ کی آمیزش، مشاہدے کی وسعت اور روح کی گہرائی سے ادا ہوئی

ہیں۔جنھوں نے ادبی زندگی کا آغاز تو شاعری سے کیا مگر اپنے عہد کے عظیم طنز نگار اعتراف کیے گئے۔کالم ''پیاز کے چھلکے'' میں فکر تونسوی کا اسلوب و انداز انتہائی دل کش اور طنزیہ ہے۔وہ اپنے کالم میں ہمیشہ عوامی پسند کے مطابق ہی تحریریں پیش کرتے تھے۔انھوں نے اپنا رابطہ براہِ راست عوام سے رکھا، اس قاری سے جو اخبار اس لیے خریدتا تھا کہ اس نے پیاز کے چھلکے کی اگلی پرت کو پڑھنا ہوتا تھا۔وہ مزاح کی چاشنی اور ظرافت کے بیچ چھپی ہوئی سنگین حقیقت کی آگاہی کرنا چاہتا تھا۔فکر تونسوی نے عام قاری کو زبان عطا کی کیوں کہ ان کی تحریریں عوام کی زندگیوں کی تلخیاں بیان کرتی تھیں۔ شاید ہی کوئی ایسا عوامی موضوع رہا ہو جس پر فکر نے کالم نہ لکھا ہو۔یہاں تک کہ انھوں نے ان معمولی انسانوں کو بھی موضوعِ بحث بنایا، جسے ہم فقیر کہتے ہیں۔فکر تونسوی نے اس طبقے کے بارے میں ''بھیک مانگنے کی حمایت میں'' اور ''گداگروں کی ٹریڈ یونین'' کے عنوان سے دو کالم لکھے۔

بلونت کارگی نے لکھا ہے:

''فکر تونسوی کے اخباری کالم میں ادبی اسلوب اور گہرائی ہوتی ہے اور یہ اس کے لیے خداداد نعمت ہے کہ پڑھنے والوں پر جیسے جادو ٹونا کر دیتا ہے۔اسے اپنے قلم پر ایک ایسا انوکھا یقین ہے کہ وہ جو کچھ لکھنا چاہے، اوٹ پٹانگ لکھے مگر وہ قاری کو اپنی ساحرانہ گرفت میں لے لیتا ہے اور لوگ اسے قبول کر لیں گے۔یہ ایک تخلیقی قوت ہے۔''

فکر تونسوی نے اپنی تحریروں میں کسی بڑے واقعہ یا بڑے انسان کو موضوع نہیں بنایا بلکہ سماج کے محروم و مظلوم، غریب و نادار لوگ ہی ان کا واحد دل پسند موضوع رہے ہیں۔ایک انسان دوست شاعر اور ادیب نے عوام کی بہتری کے لیے طنز کو حربے کے طور پر استعمال کیا۔فکر کے طنز و مزاح کی خوبی یہ ہے کہ اس سے عوام زیادہ محظوظ ہوتے ہیں کیوں کہ یہ عام فہم اور سادہ زبان میں تحریر ہوتے ہیں تاہم اس کے باوجود ادبیت میں کوئی کمی نہیں ہے۔اپنے قلم کی نوک سے ریاکاری، جھوٹ، مکر و فریب، منافقت پردہ چاک کیا ہے کہیں سیاسی اجارہ داروں کی خبر لی ہے تو کہیں منافقوں کی پول کھولی ہے۔بلاشبہ وہ عوامی فن کار ہیں اور عوام کے لیے ہی لکھتے تھے۔ان کے نزدیک ہمارے بیمار سماج کی پرتیں پیاز کے چھلکوں کی طرح ایک دوسے سے جڑی ہوئی ہیں۔وہ پیاز کے چھلکے اتارتے تھے، وہ بھی عوام کی عام فہم اور سادہ زبان میں اور یہی ان کی مقبولیت کی وجہ ہے۔

1947 میں آزادی کے بعد تقسیمِ ہند کا سانحہ فکر تونسوی کی زندگی میں ایک اہم موڑ رکھتا ہے۔ تقسیم کے سانحے نے فرقہ ورانہ فسادات کو جنم دیا اور معاشرے کی وہ ہمہ جہتی بھی پارہ پارہ ہوئی جو طویل عرصہ سے قائم تھی۔قدروں کی شکستگی نے معاشرے کو نئے زوال سے دوچار کیا۔فکر کے ہاں جو مجسم مایوسی اور دبیز بے چارگی نظر آتی ہے، وہ انھی حالات کی دین ہے اور اس ردِعمل نے انھیں معاشرے کا مذاق اڑانے پر آمادہ کیا۔وہ سنجیدہ شاعری سے طنز و مزاح کی طرف آ گئے اور طنز و مزاح سے سماجی اصلاح کے مؤثر طریقے کو اپنایا۔ان کی طنز نگاری کے پیچھے ان کی شخصی زندگی کے واقعات بھی کارفرما تھے۔آزادی اپنے ساتھ جو تباہ کاریاں لائی، اس سے فکر بہت دکھی تھے۔ہندوستان منتقل ہونے کے بعد وہ اپنے قلم سے ملک و قوم کی خدمت کرتے رہے۔ان کے لیے تمام انسان برابر تھے۔وہ کسی کے مذہب کو بنیاد بنا کر خون خرابہ پسند نہیں کرتے تھے۔فیض کی طرح انھیں بھی آزادی کا اجالا داغ داغ ہی نظر آ رہا تھا اور اسی جذبے کی بنیاد پر ''چھٹا دریا'' وجود میں آیا۔فکر لکھتے ہیں:

”آج ہمارے سامنے پھر سے نئے دھند لکے، نئے استبداد کھڑے کردیے گئے ہیں۔آؤ!انھیں چیر جائیں،انھیں پھاند جائیں اور صبح کے نقشِ قدم ڈھونڈیں،جس کے عکس تین سو سال سے ہمارے دلوں کے نہاں خانوں میں لہراتے رہے ہیں۔“

فکر تونسوی کی پوری عمر اردو ادب کی خدمت میں گذری۔انھوں نے اپنے قلم کے جوہر سے ہمارے ادب کو کئی اہم کتابیں دی ہیں۔وہ تھکنا یا ستانا نہیں جانتے تھے بلکہ زندگی بھر مسلسل سفر کے قائل رہے۔وہ صحیح معنوں میں زندگی کے ادیب تھے۔ان کے قلم سے نکلا ہر لفظ زندگی کے قریب تھا۔وہ زندگی سے،خوف ناک تاریکیوں سے گذر کر ہنستے ہنساتے ایسے نشتر چبھوتے ہیں،جن سے آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں،ہم اپنے گردونواح پر نظر ڈالنے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور بے ساختہ دل چاہنے لگتا ہے کہ ہم بھی سماجی برائیوں کو دُور کرنے کی کوشش شروع کردیں۔بہ قولِ گوپی چند نارنگ:

”فکر تونسوی نے شوکت تھانوی اور عبدالمجید سالک کی خوش گوار روایت کو ایک نئی تجدید عنایت کی ہے۔“

فکر تونسوی قلم کے مزدور تھے اور عوام کے دکھ درد اور ان کے مسائل سے بہ خوبی واقف تھے۔انھوں نے اپنے کالموں میں عوامی مسائل کا بیان بڑے ہی عمدہ اسلوب میں کیا ہے۔”بھین کی گمشدگی“یا پھر”میں نے بکری خریدی“ایسے کالم ہیں،جو فراموش نہیں کیے جاسکتے۔فکر صاحب ”میں نے بکری خریدی“میں بکری کی صفات اس طرح بیاں کرتے ہیں:

”چنانچہ ایک بکری میرے گھر میں آگئی۔بالکل گرہستن قسم کی بکری تھی یعنی اس کا بچہ بھی ہمراہ تھا۔بڑی سیدھی سادی سی بالکل کسی پرائمری گرلس اسکول کی بہن جی لگتی تھی۔سائنس اتنی ترقی کر گئی تھی مگر ابھی تک یہ پسماندہ شریف ہی تھی، سائنس نے بھینس اور گائے کے دودھ کو مشین کے حوالے کر دیا تھا اور مشین اس میں سے کریم نکال لیتی تھی اور پاؤڈر ملا دیتی تھی اور پر دودھ کو پاؤڈر سے بھی ہلکا کر کے پیش کرتی تھی اور اِسے نیشنل سروس کا نام دیتی تھی۔

فکر تونسوی نے کل ہند ریڈیو کے لیے لاتعداد ڈرامے،فیچرس اور مزاحیہ تقریریں لکھیں، جو ملک کے مختلف ریڈیو اسٹیشنوں سے نشر کی گئیں۔ان کی کئی تخلیقات کے ہندی میں تراجم بھی ہوئے۔ہندی میں بھی انھیں مشہور طنز نگار تسلیم کیا گیا۔یہ تیز وطرار قلم 12 ستمبر 1987 کو ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا یعنی فکر تونسوی اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ان کے ایک دوست نے سوال کیا کہ فکر کے مرنے کے بعد پیاز کے چھلکے کون اُتارے گا؟ تو فکر تونسوی کا جواب تھا:”فکر تونسوی بقلم خود“ اپنے پہ اعتماد ہے غیر کو آزمائے کیوں؟

یہ عظیم فن کار خراج عقیدت کا حق دار ہے،جس نے اپنے پیچھے ’ہیولے‘(شعری مجموعہ)،’پیاز کے چھلکے‘،’فکریات‘،’میری بیوی‘،’ماؤزے تنگ‘،’آخری کتاب‘،’تیر نیم کش‘،”چھلکے ہی چھلکے‘،’وارنٹ گرفتاری‘اور ’چوپٹ راجہ‘ جیسی کئی یادگار کتابیں چھوڑی ہیں۔

فکر تونسوی نے کئی سرکاری وغیر سرکاری اعزازات حاصل کیے، ان میں سے چند درجِ ذیل ہیں:

سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ	1969
یوپی اکادمی ایوارڈ (کتاب چوپٹ راجہ پر)	1972
یوپی اکادمی ایوارڈ (کتاب فکر نامہ پر)	1977
یوپی اکادمی ایوارڈ (کتاب آخری کتاب پر)	1980
میرا کیڈمی ایوارڈ	1983
بنگال اردو اکادمی ایوارڈ (کتاب فکر بانی پر)	1985
بھاشا وبھاگ پنجاب	1987
غالب ایوارڈ دہلی	1987

◻◻◻

Mrs. Maimuna Ali Chougle
304-B, Panch Dhara
Panch Marg
Versova
Mumbai 400061(M.S)

ڈاکٹر شاذیہ عمیر

زاہدہ زیدی کی ڈراما نگاری

ڈراما ایک ایسی متحرک اور فعال صنف ہے جس کے وجود میں فکر اور جذبات کا بحرِ بیکراں موجزن ہوتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ اس صنف کی ابتدا بھی دوسرے علوم وفنون کی طرح یونان سے ہوئی لیکن ہندوستان کی سرزمین پر بھی ناٹکوں اور ڈراموں کا ایک طویل سلسلہ موجود رہا ہے۔ خصوصاً سنسکرت ناٹکوں کی ایک اپنی شناخت اور پہچان ہے۔ ان میں کالیداس کا ڈراما 'شکنتلا' ایک ایسا ادبی شاہکار ہے جس کی نظیر مشکل ہے۔ اردو ڈرامے کی بات کی جائے تو اس کی عمر بہت طویل تو نہیں لیکن واجد علی شاہ کے دور میں اس صنف نے بہت ترقی کی۔ خصوصاً رہس اور کرشن لیلا کی شکل میں خود واجد علی شاہ کرشن کا کردار ادا کرتے تھے۔ اس کے بعد امانت لکھنوی کا 'اندرسبھا' ایک تاریخی قدم ہے لیکن آغا حشر کاشمیری نے اردو ڈرامے کو نئی بلندی عطا کی۔ ان کی اس روایت کو امتیاز علی تاج جیسے ڈراما نگار نے آگے بڑھایا۔ 'انارکلی' اردو ڈرامے کی تاریخ میں بے حد اہمیت رکھتا ہے۔ جدید دور میں محمد حسن کا نام خاص طور سے لیا جاتا ہے۔ 'ضحاک' میں موجودہ عہد کی منافقانہ زندگی کو جس طرح بے نقاب کیا ہے یہ اپنے آپ میں ایک اہم تخلیق ہے۔ محمد مجیب اور حبیب تنویر بھی اردو ڈرامے کا اہم نام ہیں۔

بیسویں صدی کی ابتدا میں بہت سی خواتین تخلیق کاروں نے بھی ڈرامے کی صنف میں طبع آزمائی کی۔ ان میں خالدہ ادیب خانم، زہرہ بیگم (حجاب امتیاز علی تاج کی والدہ) حجاب امتیاز علی، نذر سجاد حیدر، رشید جہاں، عصمت چغتائی، صالحہ عابد حسین، مہر رحمان، قدسیہ زیدی، جیلانی بانو اور شہناز نبی وغیرہ نے ڈرامے لکھے۔ خواتین ڈراما نگار میں دو اور نام قابل ذکر ہیں جن کے بغیر بیسویں صدی کی ڈراما نگاری کی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی ہے یعنی ساجدہ زیدی اور زاہدہ زیدی۔ ان دونوں بہنوں نے طبع زاد ڈرامے تو لکھے ہی ساتھ ہی ساتھ مغرب کے شاہکار ڈراموں کا اردو میں ترجمہ بھی کیا۔

زاہدہ زیدی کو ڈراما نگاری سے فطری لگاؤ تھا وہ بچپن سے ڈرامے کرتی آئیں، ان کی فطری بے قراری اور مغربی ادب کے مطالعے نے ڈرامہ نگاری میں انھیں کمال کو پہنچا دیا۔

ان کا پہلا طبع زاد ڈرامہ 'دوسرا کمرہ' جو 1990 میں شائع ہوا۔ اس میں کل پانچ ڈرامے شامل ہیں۔ چٹان، دل ناصبور، دوسرا کمرہ، وہ صبح کبھی تو آئے گی اور جنگل جلتا رہا'۔ یہ تمام ڈرامے 1976 اور 1980 کے درمیان لکھے گئے۔

'چٹان' وجودی طرز فکر کا مختصر ڈرامہ ہے جس میں ابسرڈ عناصر کی آمیزش بھی ہے۔ اس میں ایک عورت سے دو مرد ایکٹ کرانا چاہتے ہیں لیکن ہر بار کچھ نہ کچھ گڑبڑ ہو جاتی ہے کبھی بچہ ڈسٹرب کرتا ہے اور آخر میں

ایکٹ ادھورا رہ جاتا ہے:

''جاوید: تم لوگ ذرا ادھر کھسک جاؤ (فانی نادرہ کے دوسری طرف بیٹھا ہے) ہاں بھابی

نادرہ: میں... لیکن میں۔

فانی: دیکھو چند لمحے پہلے سارے آسمان میں آگ لگی ہوئی تھی۔ اوراب شفق کے رنگ ماند پڑتے جارہے ہیں۔ بہت جلد دن ڈھل جائے گا اور رات۔

ایک چھوٹا سا پتھر مونو کے قریب آ کر گرتا ہے جو سو چکا ہے۔ نادرہ گھبرا کے اسے گود میں اٹھاتی ہے اور کھڑے ہو کر ایک دو قدم پیچھے ہٹتی ہے۔ شدید اور جذباتی موسیقی شروع ہو گئی ہے، جس میں خطرے کا احساس ہے۔''

(دوسرا کمرہ، زاہدہ زیدی، آبشار پبلی کیشنز، علی گڑھ، 1990، ص 26)

'دل ناصبور' ایک علامتی انداز کا ڈراما ہے جس میں زندگی کی بے معنویت اور نامکمل تصویر پیش کی گئی ہے۔ اس میں راز اور ہمراز ایک ہی شخصیت کے دو روپ ہیں راز کے وژن میں روحانیت، فطرت پرستی اور حسن کاری کے عناصر یکجا ہو کر فن کے قالب میں ڈھل گئے ہیں۔ ہمراز کے وژن میں نشاط سرشاری اور لذت کوشی کو پیش کیا گیا ہے۔

''ہمراز: کیا اس کے بعد تم نے اسے کبھی نہیں دیکھا۔

راز: میں نے کئی بار اس کی جھلک دیکھی، کبھی ریلوے پلیٹ فارم پر، کبھی سنیما ہاؤس سے نکلتے ہوئے ہجوم میں، کبھی بازار کے ہنگاموں میں لیکن ہجوم کے شور میں میری آواز اس تک نہ پہنچ سکی۔ ایک بار لوکل ٹرین میں چڑھتے ہوئے اس نے میری آواز سن لی اور اس کی نظریں ہجوم میں مجھے تلاش کرنے لگیں لیکن ٹرین تیزی سے گزر گئی او روہ میری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔''

(ایضاً، ص 42)

'دوسرا کمرہ' المناک طربیہ ہے۔ یہ بھی علامتی ڈراما ہے اس میں سورج اور سونیا کی زندگی کے بنجر پن، خوف وسوسے، اور احساس جرم کو بار بار 'لاش' کے استعارے میں پیش کیا گیا ہے۔ شبانہ کا خواب بھی اسی تجربے پر روشنی ڈالتا ہے۔ رشتوں کے کھوکھلے پن اور اقدار کی شکست و ریخت ڈرامے کا موضوع ہے۔ پورا ڈراما ایک عجیب سی دہشت اور خوف پیدا کرتا ہے اور ہر بار دوسرے کمرے میں لاشوں کا اضافہ ہوتا رہتا ہے۔

'وہ صبح کبھی تو آئے گی' ہندوستانی سماج میں عورت کی بے بسی، لاچاری اور دکھ پر مبنی ہے۔ اس میں قاری بیک وقت چار مختلف اور متضاد تاثرات سے دوچار ہوتا ہے یعنی مظلوم عورت پر ظلم وستم، دوسرا راہ گیر اور پڑوسیوں کا ردعمل، فلمی گانوں کے رومانی تصورات، چوتھا کچھ بے حس لوگوں کی سرد مہری، جنھیں کوئی مرے یا جیئے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

اس مجموعے کا آخری ڈرامہ 'اور جنگل جلتا رہا' نو مناظر پر مشتمل ایک طویل ڈرامہ ہے جو ڈرامائی اسلوب، حقیقت نگاری اور علامتی طرز اظہار کا سنگم ہے۔ بظاہر یہ ایک متوسط خاندان کی زندگی کے چند دنوں کی داستان ہے، جس میں تین نسلوں کے افراد کے علاوہ دو دوست اور ایک نوکر بھی حصہ لیتے ہیں لیکن علامتی طور پر بار بار اس جلتے ہوئے جنگل کو دکھایا گیا جو ایک کائناتی وژن کو پیش کرتا ہے اور یہ ثابت کرتا ہے کہ زندگی اور موت لازم وملزوم ہیں۔ خیر النساء کا کردار انسانی تقدیر کے جبر کا اشاریہ ہے۔

دوسرا طبع زاد ڈراما 'صحرائے اعظم' ہے جو 1991 میں شائع ہوا۔ یہ پندرہ مناظر پر مشتمل 130 صفحات پر محیط ایک طویل ڈرامہ ہے۔ مصنفہ نے یہ ڈرامہ خلیجی جنگ کی خونریزی سے متاثر ہو کر لکھا۔ خصوصاً گوگو اور دیدی کا رول کافی اہم ہے۔ جس میں امریکہ کی صہیونیت، چھوٹے چھوٹے

خلیجی ممالک کو نہ چاہتے ہوئے بھی جنگ میں جھونک دینا، صدام حسین کی بہادری، امریکہ کی اجارہ داری اور اس کے ہر جائز اور ناجائز کو صحیح قرار دینے والے اس کے حمایتی، مغربی ممالک نے مصنفہ کے دل ودماغ کو گہرے طور پر متاثر کیا۔ انھوں نے اس پر ایک طویل نظم بھی لکھی اور اس بات کا اعتراف بھی کیا:

> ''صحرائے اعظم' ہمارے پُر آشوب دور کا ایک دردناک المیہ ہے جسے سیاسی طنز (Political Satire) کے طور پر پیش کیا گیا ہے اور گو کہ اس کی جڑیں عصری صورت حال اور عصری تجربات ہی میں پیوست ہیں لیکن فورم کے اعتبار سے یہ ایک واقعاتی اور حقیقت پسندانہ ڈرامانہیں بلکہ اس میں ایک مخصوص تاریخی صورت حال کے اہم پہلوؤں اور معنی خیز تفصیلات کو افسانوی رنگ روپ دے کر فرضی اور ادبی کرداروں کی مدد سے پیش کیا گیا ہے۔''

(صحرائے اعظم، زاہدہ زیدی، آبشار پبلی کیشنز، علی گڑھ، ص10-9)

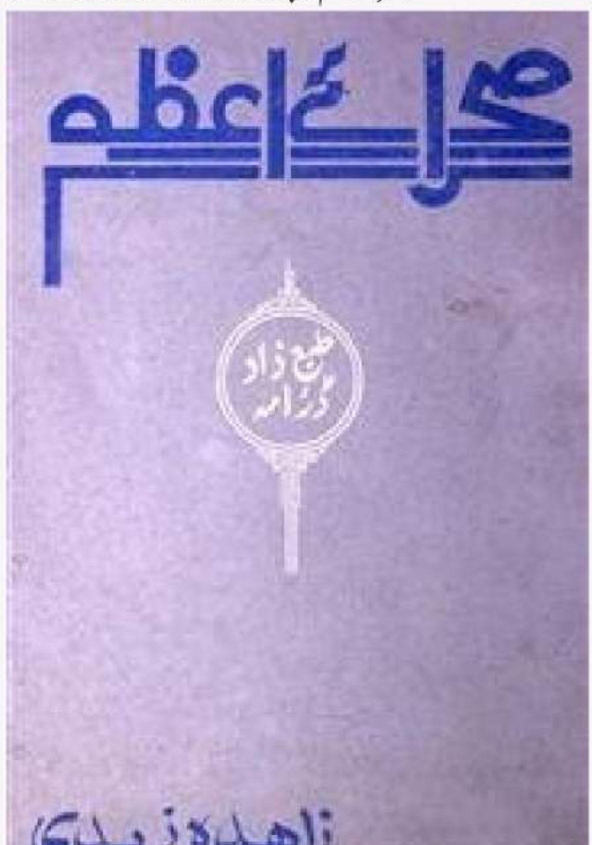

زبان وبیان، منظر نگاری اور مختلف ایکٹ میں جس طرح عام انسان کی جذبات نگاری اور المنا کو پیش کیا گیا ہے۔ اس سے ڈرامانگاری کی خلاقیت اور ذہانت کا اندازہ ہوتا ہے۔ شہنشاہ کیکلس کے کردار میں جس طرح معصوم عوام کو دھوکہ دے کر بادشاہ وقت دونوں ہاتھوں سے دولت لٹاتے ہیں اور اسے قوم کی ترقی وخوشحالی کا نام دیتے ہیں۔ ان تمام باتوں کو علامتی انداز میں یوں پیش کیا گیا ہے کہ محمد حسن کا ڈراما 'ضحاک' کی یاد تازہ ہوجاتی ہے۔

مزید اس میں، بہرام، بحرآیات، ملکۂ تنگ نظر، کنگ چن چان، شری بگلا بھگت وغیرہ کرداروں کا میلہ سا نظر آتا ہے۔ یوں صحرائے اعظم زاہدہ زیدی کا انتہائی کامیاب ڈرامہ ہے اگر چہ ڈرامے کی طوالت اسٹیج شو کے لیے رکاوٹ بن سکتی ہے لیکن مختصر کر کے اسے اسٹیج پر بھی پیش کیا جاسکتا ہے۔

'کیوں کر اس بت سے رکھوں جان عزیز' ادب کی دنیا میں بے ضمیری، نمود ونمائش، سودے بازی اور باصلاحیت تخلیق کاروں کی بے حوصلگی کی داستان ہے۔ زاہدہ زیدی کا تعلق چوں کہ مغربی ادب سے بھی رہا ہے اور مغرب میں ڈرامے کا چلن مشرق سے زیادہ ہے لہٰذا مصنفہ کا بھی ڈرامہ کی طرف خاص رجحان ہے۔ اس ڈرامے میں انھوں نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ کس طرح چھوٹے چھوٹے عہدوں پر رہتے ہوئے لوگ خود کو بڑا تخلیق کار اور بڑا ادیب ثابت کرتے ہیں اور اس کے لیے کیسے کیسے داؤ پیچ کھیلتے ہیں۔ انھیں سب باتوں کو اس میں پیش کیا گیا ہے۔ لکھتی ہیں:

> ''آج جب ہم ادب شاعری اور کلچر کی دنیا پر نظر ڈالتے ہیں تو وہاں بھی ہمیں کرپشن، زر پرستی، بددیانتی، گروپ بندی، کردار کشی، خوشامد پرستی، سطحی علمیت کی نمائش، زبان کی بے حرمتی، الفاظ کے ناجائز استعمال، کلیشے کی بالادستی اور بے بصر فارمولوں کی یلغار کے ایسے مناظر دیکھنے کو ملتے ہیں کہ نا امیدی کے گہرے بادل تخلیق کے روشن فلک پر چھائے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔''

(کیونکر اس بت سے رکھوں جاں عزیز، زاہدہ زیدی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ص7)

اس ڈرامے میں ابسرڈ ڈرامے کی بھی خصوصیات ملتی ہیں۔ اس کے کردار 'پہلا شخص' اور 'دوسرا شخص' کی گفتگو سے صورت حال واضح ہوتی ہے اور یہ دکھایا گیا ہے کہ ادب کی دکان میں اگر چہ انسان کا جسم مردہ ہو گیا ہے لیکن اس کا دل جو ضمیر کی علامت ہے ابھی بھی خون کے آنسو رو رہا ہے۔ مثال دیکھیے:

> ''دوسرا شخص: اس کے بعد اتفاقاً میری نظر میز کے نیچے پڑے ہوئے ایک پتھر پر پڑی جس کی شکل بالکل انسان کے دل جیسی تھی اور وہ بالکل سالم تھا۔ میں ہمت کر کے اس کے

قریب گیا تو میں نے دیکھا کہ وہ دل کی شکل کا پتھر نہ تھا بلکہ واقعی ایک انسانی دل تھا جس میں اب تک حرکت تھی یعنی وہ ایک انسانی دل کی طرح دھڑک رہا تھا۔

پہلا شخص: (حیرت اور پریشانی سے) اچھا واقعی۔ کیا آپ نے اسے خود انسانی دل کی طرح دھڑکتے ہوئے دیکھا؟

دوسرا شخص: جی ہاں اور اس میں سے ایک خون کی دھار بوند بوند نکل رہی تھی اور میوزیم کے اس کونے سے صدر دروازے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ بلکہ آگے جا کر اس میں سے اور بھی کئی شاخیں پھوٹ نکلیں تھیں۔

پہلا شخص: گہرے طور پر متاثر ہو کر اچھا واقعی!

دوسرا شخص: جی ہاں جو کچھ میں کہہ رہا ہوں وہ نہ صرف حرف بحرف سچ ہے بلکہ چند دن بعد لائبریرین نے مجھے بتایا کہ اس خون کی لکیر کو ٹاٹ سے گھس گھس کر مٹانے کی کوشش کی گئی لیکن وہ دھبے ابھی تک موجود ہیں۔ بلکہ کچھ دوسری جگہوں پر بھی نمودار ہو گئے ہیں۔''.(ایضاً،ص79-80)

اس واقعے کے ذریعہ زاہدہ زیدی نے یہ بتانے کی کاوش کی ہے کہ ضمیر کی آواز خواہ لاکھ دبائی جائے وہ کسی مجبوری کے تحت کچھ وقتوں کے لیے دب ضرور جاتی ہے لیکن مرتی نہیں اور اپنے وجود کا بار بار احساس دلاتی رہتی ہے۔

'بہت دور تک رات ہوگی' قتل وغارت گری پر لکھا گیا ہے۔ پورا ڈراما اس طور سے لکھا گیا ہے جیسے مصنفہ خود ان واقعات سے گزری ہوں۔ ڈرامے کی شروعات خدا اور شیطان کی گفتگو سے ہوتی ہے۔ خدا شیطان سے کہتا ہے کہ دنیا میں جاؤ اور قتل وغارت گری کا طوفان برپا کرو ایک اور کردار کیکٹس ثانی کا بھی ذکر اس میں آیا ہے جو مغرب کے سُوپر پاور کا استعارہ ہے اور جس نے پوری دنیا کو دہشت گردی میں مبتلا کر دیا ہے۔

اس ڈرامے میں جس طرح سے ایک خاص منصوبہ بندی کے تحت آگ لگائی جاتی ہے اور پھر تمام الزام بے گناہوں پر تھوپ کر قتل وغارت گری کا طوفان برپا ہوتا ہے۔ بچوں اور عورتوں کو بے آبرو کیا جاتا ہے ،نوجوانوں کو قتل کر کے ان کی لاشوں کی بے حرمتی کی جاتی ہے۔ بوڑھوں کو بے توقیر کیا جاتا ہے۔ان تمام واقعات کو مصنفہ نے اپنے دل کی گہرائی سے محسوس کیا ہے۔انسان کی بربریت دیکھ کر شیطان کہتا ہے:

''خدائے بزرگ وبرتر قتل وغارت کے اس ڈرامے میں میری حیثیت تو صرف ایک تماشائی کی تھی۔ یہ سچ ہے کہ میں اس خونی ڈرامے کے مناظر میں بالکل محو ہو گیا تھا اور اس کے مرکزی کردار کی بے داغ پلاننگ اور تخریبی ذہانت نے مجھے مسحور کر دیا تھا لیکن خدائے برتر میں اگر کوشش بھی کرتا تو اس کو کوئی نئی سمت نہیں دے سکتا تھا۔ کیوں کہ اب وہ لوگ مجھ سے کہیں آگے نکل چکے ہیں۔''

(بہت دور تک رات ہوگی، زاہدہ زیدی، آبشار پبلی کیشنز، علی گڑھ، ص200695)

ڈرامے میں خوبیوں کے ساتھ ساتھ کچھ کمیاں بھی ہیں۔ وہ یہ کہ مصنفہ اگر براہ راست اظہار کے بجائے علامتی انداز میں سانحات پیش کرتیں تو اس میں مزید ادبیت اور معنویت پیدا ہوتی۔ مزید کسی حقیقی واقعہ کے بجائے استعاراتی اسلوب میں بات کرنے سے یہ تحریر کسی خاص وقت کے قید سے نکل کر آفاقیت کی حامل ہو جاتی لیکن ان سب کے باوجود زاہدہ زیدی نے عصری حسیّت، سیاست کی مکروہ شکل، گروپ بندی، مذہبی اور نسلی منافرت کو جس طرح فنی بصیرت اور گہری نگاہ سے ڈرامے کے فن میں ڈھالا ہے یہ ان کا کمال ہے۔□□□

Dr. Shazia Omair

N-120, First Floor

Lane no. 19, Near Post Office

Abul Fazl Enclave, P-1

Jamia Nagar, Okhla

New Delhi-110025

Mob: 9650618651

Email: drshaziaomair@gmail.com

سیدہ جنیفر رضوی

احمر لکھنوی

بحیثیت غزل گو

اردو کے شعری منظرنامے اوراس کی تاریخ کے سلسلے میں جہاں مختلف دبستانوں ، تحریکوں ، رویوں اور میلانوں کا کردار شدید اہم نظر آتا ہے، وہیں اس کو ایسے جید، پختہ، ذہین وفطین اور بلند قامت شعرا بھی نصیب ہوئے ہیں جن کی اہمیت ہر عہد میں یکساں رہی ہے اور مستقبل میں بھی ان کے انفراد میں کوئی کمی واقع نہیں ہوگی ۔قلی قطب شاہ سے لے کر رنگین، آبرو، مضمون اور مظہر جان جاناں تک اوراس کے بعد والے قافلے میں جو نمائندہ شعرا غزلیہ شاعری کو سنوارنے میں غیر معمولی اہمیت کے حامل نظر آتے ہیں ان میں دبستانِ دلی اور دبستانِ لکھنؤ سے تعلق رکھنے والے کم وبیش سبھی شاعر شمار ہوتے ہیں۔ دبستانِ دلی کی اہمیت سے ہر کوئی شناسا ہے۔اس دبستان کی شاعری کو دلی واردات اور داخلیت پسندی وغیرہ سے موسوم کیا جاتا ہے۔

دلی سے دور ایک ایسا شہر پڑتا ہے جس کی تاریخ کو دہرانے سے انسان کے دل میں مسرتوں کی تند وتیز لہریں رچ بس جاتی ہیں۔اس شہر کے باشندوں کی شان وشوکت کا عالم شاہانہ رہا ہے۔ان کے اٹھنے، بیٹھنے، کھانے، پینے، پہننے ،زبان و بیان اور اندازِ بیان کے علاوہ وہاں کی محفلیں، محفلوں کی رونقیں، تکلف و تصنع، وضع قطع، چال وچلن اور باقی دیگر ایسے سماجی عناصر اس قدر اعلیٰ رہے ہیں کہ جن کو تصور میں لانے کے بعد جو منظر آنکھوں میں سما جاتا ہے وہ ہر صورت میں قابل رشک اور قابل فخر ہے۔میں جس شہر کی بات کر رہی ہوں وہ شہر لکھنو یعنی نوابوں کا شہر ہے۔اس شہر کو ناسخ و آتش نے زبان وبیان کے معاملے میں اس قدر ارفع واعلیٰ کیا کہ آج بھی دبستانِ لکھنو کی شاعری کا نام آتے ہی سب سے پہلے زبان وبیان کا پہلو ذہن ودل میں

سما جاتا ہے۔اسی شہر میں ایک ایسے قلندر نے جنم لیا جن کی اہمیت نہ صرف شعری ادب بلکہ دینی لحاظ سے بھی ممتاز ہے۔اس شخصیت کو لکھنوٴ والے احمر لکھنوی کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

اردو غزل تمام شعری اصناف کے مقابلے میں ہر دور میں ہر دل عزیز صنف رہی ہے۔اس صنفِ سخن میں اتنی گنجائش ہے کہ اس میں مشکل سے مشکل جذبہ، خیال اور احساس کو پیش کیا جا سکتا ہے۔یہ صنفِ غزل ہی ہے جس نے اردو کے مستند، ذہین اور معروف و مقبول شعرا پیدا کیے۔قلی قطب شاہ سے لے کر گلزار، جاوید اختر اور وسیم بریلوی وغیرہ تک اردو غزل کا سفر نہایت عمدہ اور دل فریب و دل کش رہا ہے اور آئندہ بھی اس صنف سے یہی توقع رکھی جا سکتی ہے۔یہ اردو شاعری کی ایسی صنف ہے جس میں ہر دور کے مزاج و منہاج کو اپنے اندر جذب کرنے کی بھر پور صلاحیت ہے۔موضوعاتی اعتبار سے اس کا دائرہ اتنا ہی وسیع ہے جتنا انسانی زندگی کے مختلف پہلو وسیع ہیں۔غزل ہیئتی لحاظ سے بھی انفرادیت کی حامل نظر آتی ہے۔شاید یہی وجہ رہی ہے کہ احمر لکھنوی اپنے احساسات و جذبات کو احسن انداز میں پیش کرنے کے لیے غزل کا انتخاب عمل میں لائے۔

احمر لکھنوی کی غزل گوئی کے تعلق سے یہ امر لائقِ تحسین و ستائش ہے کہ انھوں نے اگر چہ کلکتہ میں اپنی زندگی کا زیادہ تر عرصہ گزر بسر کیا تاہم لکھن= کی یادوں اور وہاں کے شعری خصوصاً غزلہ انفراد و امتیاز کو برقرار رکھ کر انھوں نے اہلِ لکھنوٴ ہونے کا بہترین ثبوت فراہم کیا۔احمر لکھنوی کی غزلہ شاعری متنوع موضاعات کی حامل نظر آتی ہے۔انھوں نے اپنی غزلوں میں جتنے بھی تجربات و مشاہدات پیش کیے ہیں وہ تمام مثبت سماجی رویوں کے غماز ہیں۔انسان چوں کہ حسن پرست ہے، لہٰذا وہ ہر حال میں حسن و جمال کا شیدائی ہوتا ہے اور اس کا اثر جوانی میں زیادہ ہی شدید ہوتا ہے۔احمر لکھنوی کے دل میں بھی پہلے پہلے یہی امنگیں موجیں مارتی ہوئی نظر آتی ہے۔ان کی ابتدائی شاعری میں حسن و عشق کی رنگینیاں، محبوب کے سراپا، ہجر و وصال، ستم و بے وفائی وغیرہ جیسے الفاظ کے برتاوٴ سے ایک ایسی فضا قائم ہوتی ہے جس میں احمر لکھنوی کا دل دیوانہ وار دھڑکتا ہوا نظر آتا ہے۔وہ کبھی اپنے محبوب سے گلہ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں اور کبھی ان کے تلخ رویے سے مجروح ہوتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔اس نوع کے یہ اشعار ملاحظہ کیجیے:

پانی پانی ہوگیا اپنے کئے پر بے وفا
میں نے چھیڑا جب فسانہ اس ستم ایجاد کا

اس بتِ کافر ادا نے جب سے لوٹا ہے مجھے
ہر جگہ ہوتا ہے چرچہ خانماں برباد کا

قیس و فرہاد کے قصے بھی سنے ہیں لیکن
ڈھنگ کچھ اور ہے احمر تیرے افسانے کا

☆

رخ سے زلفیں جو ہٹیں چاند سا مکھڑا دیکھا
روئے روشن کا یہ انداز نرالا ہے

☆

احمر لکھنوی کی ابتدائی دور کی شاعری اگر چہ رومانی کیفیات سے عبارت ہے، تاہم اس میں عریانیت، فحش، بے حیائی اور حوس پرستی کا عمل دخل کسی بھی پہلو سے نظر نہیں آتا ہے۔ان کے عشق و محبت کا جذبہ خالص ہے۔وہ عشق و وفا کی قربانیوں سے اچھی طرح واقف ہیں اور انھیں اپنے محبوب کے ظلم و ستم، بے وفائی و بے رخی، امتحان اور اس کے حربوں کو سلیقے سے نپٹنا خوب آتا ہے۔احمر لکھنوی ضبط سے کام لے کر عشق میں نبھا کرتے ہیں۔انھیں اپنی محبت کافی عزیز ہے۔وہ عشق میں وصل کے متمنی ہیں اور ہجر سے پرے رہنے کی تدبیریں ان کے پاس نظر آتی ہیں۔چنانچہ کہتے ہیں:

جلائی ہے شمعِ وفا مشکلوں سے
اسے تم بجھانے کی کوشش نہ کرنا

احمر لکھنوی کی ابتدائی دور کی غزل گوئی رومانوی عناصر کی حامل نظر آتی ہے۔رومانوی فضا کو قائم کرنے کے لیے ان کے ہاں اسلوب کا جو نظام کارفرما نظر آتا ہے وہ قابلِ رشک ہے۔ان کے ہاں نہایت سادہ مگر لطیف الفاظ در آئے ہیں۔اسی طرح احمر لکھنوی کے اس دور کی شاعری میں ترکیبوں کا انوکھا اور متاثر کن اظہار بھی ملتا ہے۔ہوئے چمن، سرِ محفل، فراقِ زلفِ جاناں، نگاہِ شوق، سطحِ آب، جانِ بہار، شہیدِ ناز وغیرہ جیسی ترکیبیں احمر کی شاعری میں جدت طرازی پیدا کرتی ہیں۔ان ترکیبوں کے تخلیقی برتاوٴ سے احمر کی شاعری میں نہ صرف رنگینی و شیرینی کا احساس ہوتا ہے بلکہ ان کے استعمال سے انھوں نے اپنے جذبات و احساسات کی شدت کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ان کے سادہ اور پر لطف اسلوب کا یہ نمونہ دیکھیے:

دل کسی سے لگا کے دیکھ لیا
چوٹ پر چوٹ کھا کے دیکھ لیا
چین آتا نہیں کسی پہلو
تم نے مجھ کو ستا کے دیکھ لیا

☆

احمر لکھنوی نے اپنی ابتدائی غزلہ شاعری میں جہاں عشق و محبت کے جذبے کا بے ساختہ اظہار کیا ہے وہیں انھوں نے باقی دوسرے سماجی

معاملات کو بھی پیش کیا ہے۔ ان معاملات میں مذہب، شراب، ساقی، تنگ دستی، غم والم وغیرہ جیسے عناصر شامل ہیں۔ وہ ان تمام عوامل کا اظہار تو کرتے ہیں لیکن ان سے جو نتیجہ اخذ ہوتا ہے وہ مایوسی کی بجائے مسرت وشادمانی کی بشارت سناتے ہیں۔ نمونے کے طور پر یہ اشعار دیکھیں:

ہوائے چمن ہے مخالف اے غنچو
ابھی مسکرانے کی کوشش نہ کرنا

☆

ہزاروں رنج وغم سہ کر بھی میں ہنستا ہوں اے احمر
بشر کے واسطے ہے لازمی ثابت قدم ہونا

☆

تشنہ لب آیا ہوں میخانے میں ساقی تیرے
چشمِ مخمور سے ساغر ہو عطا آج کی رات

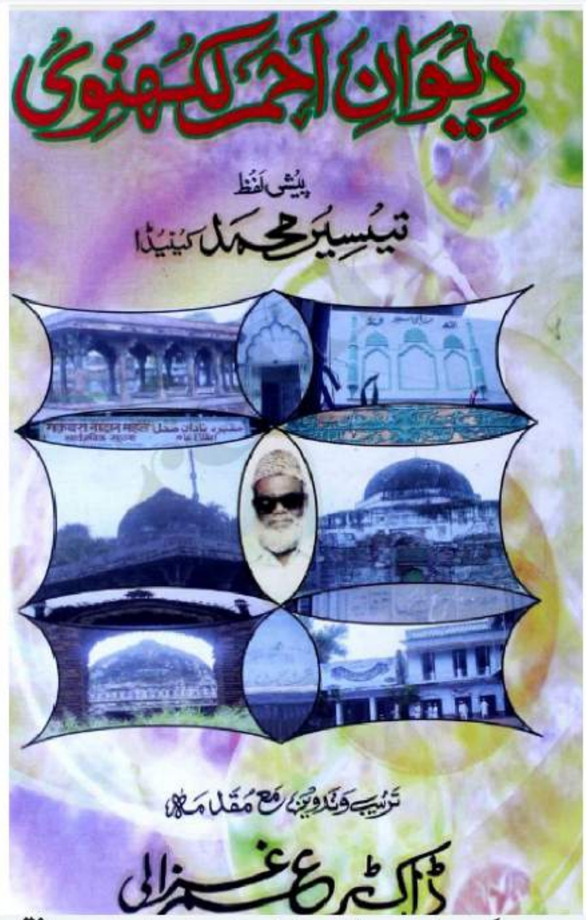

احمر لکھنوی کی شاعری کو ان کے فرزند تیسیر محمد نے دو ادوار میں منقسم کیا ہے۔ ان کی پہلے دور کی شاعری کے تعلق سے وہ کہتے ہیں:

''ابا کی اس دور کی شاعری ابتدائی طور پر رومانی ہوا کرتی تھی جس میں مذہبی خیالات کا بھی خاصا دخل تھا۔ الفاظ سہل اور سامنے کے لیے چاشنی سے بھرے اور جو سماعت سے ہم آہنگ ہو کر دل میں اترنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ یہ غزلیہ روایتی انداز اور ان کا ادبی طرز بیان آج کے دور میں منفرد حیثیت کا حامل ہے، ان کے اندر فطری طور پر غالب ہے، ان کی اس دور کی شاعری میں گلابی زندگی، روایتی مجنونانہ کیفیت، صوفیانہ عکس، مجذوبانہ کیفیت، زلف ورخسار شیخ وزاہد، شراب وشباب اور ہجر ووصال کا بے کم وکاست ذکر ملتا ہے۔'' (ص:16)

اس طرح سے یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ احمر لکھنوی کی ابتدائی شاعری میں سب سے اہم موضوع رومان کی مختلف کیفیتوں کا اظہار ہے اور اس کے علاوہ انھوں نے جتنے بھی مضامین برتے ہیں ان کی تعداد کم ہی ہے۔ اس دور کی شاعری سے احمر لکھنوی کو یہ فیض بہم پہنچا کہ انھوں نے آگے چل کر غزلیہ شاعری کے میدان میں نئے نئے موضوعات کو ایک نئی آب وتاب اور ایک نئے رنگ وآہنگ میں پیش کرنا شروع کیا۔ اس طرح احمر لکھنوی کی ابتدائی دور کی شاعری خصوصاً صنفِ غزل میں ایک حد تک فنی اور فکری بصیرت کا بہترین اور موثر امتزاج نظر آتا ہے۔

احمر لکھنوی کی غزل گوئی کا دوسرا دور کافی اہمیت کا حامل نظر آتا ہے۔ اس دور میں آپ کی شاعری میں فنی پختگی کا مظاہرہ جابجا نظر آتا ہے۔ زبان وبیان، تخیل، فنی پختگی، تجربات ومشاہدات وغیرہ کا احمر لکھنوی کی غزلوں میں اس قدر توانا اظہار ملتا ہے کہ ان کے مطالعے سے قاری متاثر رہے بغیر نہیں رہ پاتا۔ دوسرے دور کی شاعری کی ابتدا ہی سے احمر لکھنوی مشاعروں کی زینت بنے رہے۔ اس دوران ان کے فرزند محمد تیسیر ان کے ساتھ ہمیشہ رہا کرتے تھے۔ محمد تیسیر اپنے والد کی اس دور کی شاعری کے حوالے جتنی اہم باتیں بیان کرتے ہیں، ان سے یہ بات اخذ کی جاسکتی ہے کہ احمر لکھنوی اس عرصے میں اپنی غزلیہ شاعری کو لے کر شدید سنجیدہ نظر آتے ہیں۔ ان کے اندر کا شاعر شاعری کے ہر پہلو میں اپنے آپ کو نکھارتا اور پختہ کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس سے احمر لکھنوی کو یہ فائدہ ملا کہ ان کے مداحوں کا ایک خاص حلقہ سامنے آنے لگا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس میں اضافہ ہوتا ہی گیا۔ اس دور کی شاعری میں احمر لکھنوی نے فن شاعری کے اصولوں کو گہرائی کے ساتھ اپنی شاعری میں استعمال کر کے ایسے تجربات کیے جو موضوع کے حوالے سے انوکھے اور اہم کہے جاسکتے ہیں۔ اس دور میں آپ کے ہاں موضوعات کا جو تنوع نظر آتا ہے وہ پہلے دور کی شاعری

کے مقابلے میں منفرد اور مختلف ہے۔ اس دور میں آپ کی غزلوں میں جو جدت وندرت اور تازگی سما گئی ہے اس کے تعلق سے یہ بات اہمیت رکھتی ہے کہ آپ کی شاعری میں نہ صرف لکھنوی رنگ و آہنگ سما گیا بلکہ موضوع کے حوالے سے اس میں دبستانِ دلی کی بھی کرنیں پھوٹتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ ان کی شاعری میں جہاں ایک طرف روایتی شاعری کا اظہار ملتا ہے وہیں دوسری طرف انھوں نے جدیدیت سے متاثر ہوکر ایسے بھی اشعار کہے جو نفسِ مضمون کے حوالے سے تازہ ہیں۔ ان کے دوسرے دور کی شاعری کا یہ نمونے دیکھیے:

سینچا لہو سے میں نے چمن باغ باں نہیں
پھولوں میں میرے خون کی کیا سرخیاں نہیں
مجھ کو چڑھا کے دار پہ بولے وہ ناز سے
یہ دل لگی سمجھئے ابھی امتحاں نہیں

☆

وقت نے ترسا دیا ہے دانے دانے کے لیے
کتنا عبرت ناک عالم ہے زمانے کے لیے

☆

قاروں کے خزانے پہ بھی اس کو کہاں بس ہے
دراصل یہ انسان بڑا اہلِ ہوس ہے

☆

شوقِ دل کی رہبری میں سوئے منزل جو بڑھے
ہر قدم پر راہ میں وہ ٹھوکریں کھاتے رہے

احمر لکھنوی ہمت و حوصلے کے شاعر ہیں۔ ان کی شاعری انسان کو بے بسی، محرومی، ناامیدی، غم والم، کی بجائے عزم و حوصلہ، امید و بیم، خوشی اور طرب، جذب و مستی، محبت و ہمدردی، رند و مستی وغیرہ جیسی صفات عطا کرتی ہے۔ وہ اپنی غزلوں میں جہاں مذہبی لے دکھاتے ہوئے نظر آتے ہیں وہیں انھیں رومان کی پر کیف اور صاف و پاک صحبتیں سرشار کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اس معاملے میں وہ اپنے محبوب کے ساتھ میانہ روی سے پیش آتے ہیں۔ اگر کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ احمر لکھنوی کا محبوب لکھنؤ کی محفلوں، گلی کوچوں اور بازاروں کا شیدائی نہیں ہے بلکہ وہ کہیں کہیں پر نہایت سادہ، صاف گو، بے کینہ، نفاست کا پابند، شرم وحیا کا پیکر اور ضبط وغم کی چادر اوڑھے ہوئے نظر آتا ہے۔ اسی طرح اگر احمر کا محبوب کبھی احمر پر برہم ہوتا بھی ہے تو وہ روٹھنے، جھگڑنے یا غصہ کرنے کی بجائے صبر و تحمل سے کام لیتا ہے۔ دونوں مفروضات کے اعتراف میں یہ اشعار دیکھیے:

کیا بات کہی میں نے جو آپ ہوئے نادم
کیوں سرمگیں آنکھوں سے یہ اشکِ گہر نکلے

☆

نہ ثانی ہوا کوئی اس خوب رو کا
زمانے نے کتنے ہی پیکر تراشے

☆

کرتے رہے وہ مشقِ ستم مجھ غریب پر
شکوہ مگر ذرا نہ کیا دل فگار نے

احمر لکھنوی نے اپنی غزلوں میں عشقیہ جذبات کی متنوع کیفیات کے ساتھ ساتھ مذہبی معاملات کو بھی داخل کیا ہے۔ وہ چوں کہ اسلامی احکام کے سخت پابند تھے۔ عشقِ محمد ﷺ ان کی ذات کا اہم حصہ رہا ہے اور اس معاملے میں وہ عملی طور پر بھی سرگرم نظر آتے رہے ہیں۔ توحید و رسالت اور احکامِ شریعت کو انھوں نے جس انداز سے اپنی شاعری کے ذریعے پیش کیا ہے، اس کی مثالیں اردو شاعری میں نادر ہیں۔ احمر لکھنوی کو حضرت محمد ﷺ کی ہر ادا متاثر کرتی ہے اور وہ اس پاک ہستی کے حضور اپنی شاعری کے ذریعے سراپا نادم ہو جاتے ہیں۔ توحید و رسالت پر مبنی احمر لکھنوی کے یہ اشعار دیکھیے کہ کس طرح ان میں عقیدت کا بے لاگ اظہار ملتا ہے:

بھول جاؤں کیسے اس محبوب کو ممکن نہیں
جس کا لطفِ خاص احمر راحتِ جاں ہو گیا

☆

احمر کسی سے کیا کریں ہم عرضِ مدعا
ہم کو کلامِ پاک سے کیا کچھ ملا نہیں

☆

اس کی قسمت بن گئی اس کا مقدر جاگ اٹھا
خواب میں حاصل جسے تیری زیارت ہو گئی

☆

بکھری ہوئی زلفوں سے یوں نکلا رخِ انور
بادل کے دریچے سے جس طرح قمر نکلے

بلا مبالغہ احمر لکھنوی کی غزلوں میں لفظیات کا سحر کن نظام پایا جاتا ہے۔ ان کے ہاں فصاحت و بلاغت کی عمدہ جھلکیاں، ترکیبوں کا خوب صورت جال، استعارہ و تشبیہات کا دل کش نظام اور اسی طرح باقی شعری وسائل کا بھرپور نظام نظر آتا ہے۔ ساقی، رند، مے، زنداں، عشق، ستم، صیاد، نشہ، شیخ، زاہد اور اس طرح کے پر کیف الفاظ ان کی غزلوں میں زیادہ تر

استعمال ہوئے ہیں۔اسی طرح ان کی غزلوں میں دلِ حزیں، آتشِ فراق، راہِ حق، شہیدِ ناز اور بتِ بے مثال وغیرہ جیسی ترکیبوں کے استعمال سے خوب صورت آہنگ پیدا ہوتا ہے۔عام طور پر احمر لکھنوی اپنی غزلوں میں ان ہی استعارات کا استعمال کرتے ہوئے نظر آتے ہیں جن کا ماخذ اسلامی تاریخ ہے۔وہ انسانی بقا کے لیے ایسے اشعار بھی کہتے ہیں جن سے عبرت کا سامان مہیا ہوتا ہے۔احمر لکھنوی نے کیا خوب کہا ہے:

لن ترانی کرنے والے تو بہت پیدا ہوئے
مثلِ موسیٰ آج تک لیکن ہوا کوئی نہیں

☆

عشق کی ہمت جو دیکھی آتش، نمرود نے
ہو گیا احمر وہ گلشن اپنی فطرت کے خلاف

احمر لکھنوی کی غزلوں میں موضوعاتی رنگا رنگی بولتی ہوئی نظر آتی ہے۔ان میں تغزل کا بہترین امتزاج در آیا ہے۔انھیں ہر رنگ میں شعر کہنا آتا ہے۔ان کی شاعری کے سلسلے میں عمر غزالی کہتے ہیں:

''احمر لکھنوی کی شاعری میں موضاعات کا تنوع ملتا ہے۔ جہاں عشقِ حقیقی ومجازی کے علاوہ دنیا کی بے ثباتی کا ذکر ملتا ہے، زندگی کے شب و روز کو جگہ دی گئی ہے اور دیگر وہ تمام موضوعات جو ہمارے ارد گرد گھومتے نظر آتے ہیں، ان تمام موضوعات کو بڑی ہنرمندی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔''

(ص:33)

احمر لکھنوی کی غزلوں میں قلبی واردات اور نفسیاتی الجھنوں کا اظہار قاری کے دل میں ہمدری اور محبت پیدا کرتا ہے۔وہ عشقِ مجازی کے ساتھ ساتھ عشقِ حقیقی میں جتنے بھی ہجر کے زخم کھاتے ہیں، ان پر وہ اکثر صابر نظر آتے ہیں۔ان کے بعض اشعار ایک بسملِ جاں کے دل سے نکلے ہوئے نالے معلوم ہوتے ہیں۔تاہم ان نالوں میں بے بسی اور کم ہمتی کا اظہار برائے نام ہے۔وہ جہاں سماج پر تنقیدی نگاہ ڈالتے ہوئے نظر آتے ہیں وہیں وہ شیخ و زاہد کو بھی طنز کا نشانہ بناتے ہیں۔وہ اگر اپنے محبوب کے ہاتھوں مٹ بھی جاتے ہیں تاہم انھیں اس بات کا علم ہی نہیں ہوتا ہے۔احمر لکھنوی کے درج ذیل اشعار سے پتا چلتا ہے کہ ان کے ہاں کون سے تجربات اور احساسات کس جذبے کو ابھارتے ہیں:

غیر پر انگلی اٹھانے کو تو بس تیار ہیں
اپنی نادانی کو لیکن سوچتا کوئی نہیں

اللہ اللہ بادۂ عشقِ حقیقی کا سرور
مے کشی سے آج تک احمر بچا کوئی نہیں

☆

کیوں جہاں والے ہمیں کرتے ہیں رسوا بے سبب
واسطہ کیا عشقِ بت سے وعظِ دیں دار کو

☆

جلن کیوں کم نہیں ہوتی میرے قلبِ سوزاں کی
کوئی تدبیر اب تو چارہ گر کر راحت جاں کی

احمر لکھنوی کی غزلوں کے تعلق سے مجموعی طور پر یہی کہا جا سکتا ہے کہ ان کے عمیق مطالعے سے ان کے افکار، مشاہدات، میلانات اور ان کی فنی مہارت کا بہ خوبی اندازہ ہوتا ہے۔انھوں نے ظاہری طور پر زندگی کی رعنائیوں اور اس کی دلکشی کو اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا ہے، تاہم ان تمام چیزوں کو انھوں نے جس گہرائی اور جس انداز سے محسوس کیا ہے اس کا واضح اظہار ان کی شاعری سے ہوتا ہے۔وہ باطن کی آنکھوں سے اپنے آس پاس کے ماحول کو دیکھتے اور غور و فکر کرتے ہیں۔ان کی شاعری میں جو رس اور جو رنگ رچا بسا ہے وہ صرف ان کا اپنا امتیاز ہے۔حق گوئی ان کی شاعری میں ایک نئی روح پھونکتی ہے۔احمر لکھنوی مبالغہ آمیزی سے اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کرتے ہیں۔وہ جو کچھ بھی کہتے ہیں، اس میں صاف گوئی اور خلوص نظر آتا ہے۔وہ غیر اخلاقی حرکات وسکنات اور بے جا باتوں کے علاوہ رسمی انداز اور اس کے اظہار سے اپنے آپ کو بچاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس بات سے کوئی اختلاف ہی نہیں ہو سکتا ہے کہ احمر لکھنوی کا شعری جوش اور ولولہ زیادہ تر صنفِ غزل ہی میں ٹھاٹھیں مارتا ہوا نظر آتا ہے۔انھوں نے اس صنف میں جتنے بھی فنی، فکری اور عصری تجربات سرانجام دیے ہیں، وہ تمام تجربات ہر پہلو سے لائقِ تحسین وستائش ہیں۔میں احمر لکھنوی کے درجِ ذیل شعر کے ساتھ ان کی غزلیہ شاعری کا اختتام کرتی ہوں:

رہِ عشق میں اپنی ہستی مٹا دے
جو تسکینِ قلب و جگر چاہتا ہے

□□□

Syeda Jenifar Rezvi
C/o. Syed Shakil Raza
Village: Jublee Tank
Lal Bagh
Distt. Murshidabad-742149 (W.B)
Mob:7872873542
E-mail:syedarezvi@yahoo.com

عائشہ ضیا

ادبِ اطفال کا نسائی اظہار

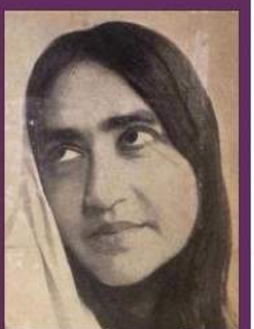

ہندوستانی معاشرے میں پدراساس نظام اور روایتی خاندانی اقدار نے بچوں اور خواتین کے مابین رشتے اور ترسیلی مواقع کو فروغ دینے اور اسے مضبوط بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ خواتین اور بچوں کے مابین انسیت اور قربت کی فطری صورتیں بچوں کو سمجھنے ان کی نفسیات سے آگاہ ہونے کے امکانات زیادہ پیدا کرتی ہیں۔ خواتین ان کی اشاراتی اور لفظی ترسیل کے مراحل سے بخوبی آشنا ہی نہیں ہوتیں بلکہ ان کی زبان پر لفظوں کو اُگتے، بڑھتے اور پروان چڑھتے دیکھتی اور سنتی ہیں۔ اس لیے بچوں سے متعلق زبان اور طرزِ اظہار کا تجربہ اور علم جس قدر خواتین کو ہوتا ہے مردوں کو کم ہی ہوتا ہے۔ بچوں کو روایتی قصے کہانیاں سنانے کا کام بھی اکثر خواتین ہی کرتی رہی ہیں۔ اس لیے بچوں کے لیے فکشن نگاری کی رو سے جو امکانات خواتین تخلیق کاروں میں ہو سکتے ہیں۔ ان امکانات کا مرد قلم کاروں میں نسبتاً کم ہونا عین فطری بات ہے۔ زبان کا شعور آغوشِ مادر سے لے کر اسکول کی دہلیز تک، حرف شناسی سے لے کر عبارت خوانی اور متن کی قرآت تک کے مراحل سے گزرتا ہے۔ خواتین قلم کاران مراحل کے جملہ پہلوؤں کو اپنے ادبی اظہار کا حصہ بناتی ہیں۔

بچوں کا ادب ان کی ذہنی و جمالیاتی خوراک سے عبارت ہے۔ جس طرح ایک شیر خوار بچے کی قوت ہاضمہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے قدرت نے اس کے لیے نرم غذا کو بہم کرنے کا طبعی نظام دیا، ذہنی و جمالیاتی شیر خوارگی کو غذا پہنچانا باشعور تعلیم یافتہ طبقے کے لکھنے والوں کی ذمہ داری ہے۔ ذہن کی معصومیت، سیکھنے کی اہلیت، سمجھنے کی استعداد کو مدنظر رکھتے ہوئے ادب اطفال کی تخلیق، سنجیدہ ترین ادبی سرگرمی بن جاتی ہے۔ سب سے اہم بات یہ کہ تمام تر سنجیدگی کے باوجود ادبِ اطفال کے متن کو دلچسپ اور پر از ترغیب وتحریک بھی رکھنا ضروری ہے۔ ادب اطفال کی اس اہمیت اور نزاکت کو پیش نظر رکھتے ہوئے جب ان قلم کاروں اور خاتون فکشن نگاروں کی خدمات پر نظر ڈالتے ہیں جنھوں نے فکشن کو ثروت مند بنانے میں اہم رول ادا کیا ہے تو ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ادب اطفال میں

بھی تخلیقی لحاظ سے سرگرم رہیں۔

اردو ادب میں جدید فکشن کی ثروت مندی کا زمانہ ترقی پسند تحریک کا زمانہ ہے۔ ترقی پسند تحریک کے لکھنے والوں نے اعلی پایہ کا افسانوی ادب تخلیق کیا اس عہد کے لکھنے والوں نے ادب اطفال پر بھی توجہ دی۔ حجاب امتیاز علی، جو اردو کے ادبی معاشرے میں ایک افسانہ نویس، ناول نگار اور ڈرامہ نگار کی حیثیت سے معروف ہیں، انھوں نے جدید ادبِ اطفال کی تخلیق میں بھی دلچسپی لی۔ حجاب امتیاز علی کی ادب اطفال سے متعلق تحریریں بچوں کے رسالے ماہنامہ 'پھول' میں شائع ہوا کرتی تھیں۔ بچوں کا یہ رسالہ ایک لحاظ سے حجاب کا خاندانی رسالہ تھا۔ اس رسالے کو ان کے خسر مولوی سید ممتاز علی نے اپنے ذاتی پریس 'رفاہ عام پریس' سے 1901 میں جاری کیا، مولوی سید ممتاز علی 'تہذیب نسواں' کے بانی بھی تھے۔ 'پھول' نامی رسالہ ایک مختصر رسالہ تھا۔ اس رسالے میں بچوں کے لیے اہم عالمی وملکی خبریں، نظمیں، کہانیاں، ہم عصر تاریخ وغیرہ جیسے مواد شائع ہوتے تھے اس کے شماروں کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس رسالے کا معیار کافی بلند تھا۔ زبان بچوں کے مزاج سے ہم آہنگ ہوتی تھی۔ خبر، تاریخ، نظم اور کہانی سب کی پیشکش کا انداز بہت ہی فطری اور معلوماتی تھا۔ امتیاز علی تاج جس زمانے میں اس رسالے کی ادارت کے فرائض انجام دے رہے تھے حجاب امتیاز علی نے بھی اس کی ادارت میں حصہ لیا۔ 'طوطے کا پنجرہ'، 'شہزادی گل رخ' اور 'الہ دین کا چراغ' ادب اطفال کے سلسلے میں حجاب کی نمائندہ نگارشات ہیں۔ حجاب امتیاز علی نے جو کچھ بچوں کے لیے لکھا اس میں بچوں کی دلچسپی کی چیزیں ہوتی تھیں۔ داستانوں اور طلسماتی عناصر سے بھی وہ کام لیتی تھیں۔ ساتھ ہی سبق آموزی کا پہلو بھی ان کی کہانیوں میں پایا جاتا ہے۔ 'نسانی کنبہ' اس کی اچھی مثال ہے۔ اس کہانی میں وہ ایک طرف تتلی جیسی خوبصورت مخلوق کو نہ ستانے اور نہ پکڑنے کی ترغیب دیتی ہیں تو دوسری طرف ہنگامی حالت میں کسی کے زخمی ہونے پر اس کی مدد کی تحریک بھی پیدا کرتی ہیں۔

بچوں کے ادب کو دیدہ زیب دلچسپ تصویروں کے مرقع کے ساتھ باہتمامِ خاص شائع کروانے کا فخر جس ہستی کو حاصل ہے وہ قدسیہ زیدی ہیں۔ قدسیہ زیدی آل انڈیا ریڈیو سے وابستہ بخاری برادران کے اقرباء میں سے تھیں۔ ان کے شریکِ حیات زیدی صاحب ذاکر حسین کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر بنے تھے۔ قدسیہ زیدی ادب، ڈرامہ، تھیٹر اور نسائی اصلاح وغیرہ کے کئی اہم ادبی اور سماجی کاموں میں سرگرم رہیں۔ وہ نہایت فعال روشن خیال خاتون تھیں۔ بچوں کے لیے وہ خاص اہتمام سے لکھتی تھیں اور کہانی، معلوماتی مضمون اور ترجمہ کے مختلف میدانوں میں ادب اطفال کا مواد تیار کرتی تھیں۔ صالحہ عابد حسین نے قدسیہ زیدی کے بارے میں لکھا ہے:

> ''اس سے بھی عجیب بات یہ ہے کہ اس ناسازگار ماحول میں انھیں بچوں کے ادب سے دلچسپی پیدا ہوئی اور نہ صرف اس کے لیے وقت نکالا، بلکہ دل و جان سے اس میں لگ گئی۔ انگریزی زبان کی سینکڑوں بچوں کی کتابوں کو پڑھا، تصویروں کا مطالعہ کیا اور یہ دھن میں لگ گئی کہ اردو میں بچوں کے لیے بہترین چھپائی لکھائی اور تصویروں کے ساتھ کہانیوں کی دلچسپ کتابیں شائع کی جائیں۔ انھوں نے بچوں کا ادب کھنگالا اور اس میں جو موتی نظر پڑا اسے چن لیا۔ جو کہانی پسند آئی اسے وہ ہندوستانی روپ میں ڈھال کر سلیس، رواں، آسان زبان میں بچوں کے لیے اردو کی ایک پیاری سی کتاب مرتب کر دیتیں۔''

(مالک رام، قدسیہ مشمولہ قدسیہ زیدی مرتب بشیر حسین زیدی، مکتبہ جامعہ نئی دہلی 2013، ص9تا29)

قدسیہ زیدی بچوں کا ادب تخلیق کرنے میں حد درجہ سنجیدگی، بیدار مغزی، محنت اور کدو کاوش کی قائل تھیں۔ وہ روا روی اور عجلت میں یہ کام نہ نپٹاتی تھیں بلکہ پورے اہتمام وانہماک سے دقت نظر کے ساتھ اس کام کو انجام دیتیں۔ صالحہ عابد حسین لکھتی ہیں:

> ''گاندھی بابا کی کہانی لکھنے میں جتنی محنت اور جاں کاہی قدسیہ نے کی اکثر لوگ بڑے بڑے علمی و تحقیقی مقالے لکھنے میں اس سے آدھی زحمت بھی گوارا نہیں کرتے۔ کئی کئی بار ایک ایک باب کو لکھتیں، زبان اور ادب کے ماہرین کو دکھاتیں، گاندھی جی سے جو لوگ بہت قریب تھے، ان سے مشورہ لیتیں۔ بار بار ترمیم و تنسیخ کرتیں۔ کسی سے مشورہ یا مدد لینے میں انھیں ذرا بھی جھجھک نہ ہوتی تھی۔''

(مالک رام، قدسیہ مشمولہ قدسیہ زیدی مرتب بشیر حسین زیدی، مکتبہ جامعہ نئی دہلی 2013، ص33)

قدسیہ زیدی نے قدرت کی طرف سے طبعی عمر نہ حاصل کی اور 45 سال کی عمر میں ہی گرفتار عارضہ دل ہو کر اس دنیا سے رخصت ہو گئیں لیکن اس مختصر عرصے میں تھیٹر اور ادب اطفال کے دونوں شعبوں کو اعلی معیار تک لے جانے میں انھوں نے جو کوششیں کیں اور جو کامیابیاں حاصل کیں اس کی وجہ سے ان کا نام ہمیشہ یاد کیا جائے گا۔

صالحہ عابد حسین کی ہستی گونا گوں صفات کی حامل تھی وہ قومی تحریک اور قومی تعلیمی تحریک کے سرخیلوں کی قربت یافتہ رہیں۔ عابد حسین جیسے دیدہ ور عالم اور صاحب بصیرت ماہر تعلیم اور تہذیبی مؤرخ کی مصاہرانہ معیت نے انھیں اور بھی نکھارا وہ پہلے سے ہی حالی کے خانوادے سے نسبت رکھتی تھیں۔ صالحہ عابد حسین نے افسانے، ناول، ڈرامہ، تنقید و تحقیق اور ادب اطفال کے مختلف میدانوں میں اپنے تخلیقی نقوش چھوڑے۔

صالحہ عابد حسین کی ادب اطفال سے متعلق تخلیقات عابد حسین کی ادارت میں شائع ہونے والے بچوں کے رسالے 'پیام تعلیم' میں شائع ہوئیں۔ ان کی بہت سی کہانیاں اور بچوں کی کتابیں کتابی شکل میں 'مکتبہ جامعہ' اور 'نیشنل بک ٹرسٹ' دہلی سے شائع ہوئیں۔ انھوں نے بچوں کے لیے کہانیاں لکھیں۔ ہندوستانی معماروں کی حیات پر مشتمل کتابیں تصنیف کیں، ڈرامے اور مضامین بھی تحریر کیے۔ 'سندر چنار'، 'ایک دیس ایک خون'، 'زعفران پریوں کے دیس میں'، 'انوہا اور کالا کنواں' بچوں کے لیے لکھے گئے فکشن میں صالحہ عابد حسین کی نمائندہ تخلیقات ہیں۔ صالحہ عابد حسین کے ذریعے بچوں کے لیے لکھے گئے فکشن میں کئی خوبیاں ایک ساتھ نظر آتی ہیں۔ ایک طرف وہ کہانی پن اور واقعات کو سلیقے سے بنتی ہیں۔ مناظر کو ابھارتیں، فضا کو اتارتی ہیں تو دوسری طرف کہانی میں انسان اور انسانیت، عدم تشدد اور خلوص کے عناصر کو بڑی خوش اسلوبی سے سمو لیتی ہیں۔ اس طرح ان کے ذریعہ لکھی گئی کہانیاں زبان کے حسن، قصے کی دلچسپی اور سبق آموزی کی دولت سے مالا مال ہو جاتی ہیں۔

عصمت چغتائی اپنی مخصوص زبان، اچھوتے موضوعات اور بے ساختہ طرزِ بیان کی وجہ سے اردو فکشن میں انمٹ مقام کی حامل ہیں۔ انھوں نے ناول، افسانے، ڈرامے کی شکل میں اپنی تخلیقی یادگاریں چھوڑی ہیں۔ عصمت نے بچوں کے لیے بھی لکھا اور خوب لکھا۔ عصمت نے بچوں کے لیے جو کہانیاں لکھیں ان میں 'سفید جھوٹ' (کھلونا 1965)، 'بشیرے کی ماں' (کھلونا فروری 1976)، 'بلی کا کرشمہ' (کھلونا اکتوبر 1958)، 'قدرت کا مذاق' (کھلونا فروری 1975) ادب اطفال میں لازوال کہانیوں کی حیثیت سے جانی جاتی ہیں۔ بچوں کے لیے لکھے گئے ناولوں میں 'تین اناڑی' قابل ذکر ناول ہے۔ اس ناول کے بارے میں خوشحال زیدی لکھتے ہیں:

"تین اناڑی بچوں کا ایک دلچسپ ناول ہے۔ اس ناول میں نہ تو بچوں میں حیرت واستعجاب ابھارنے کی کوشش کی گئی ہے اور نہ ہی مافوق الفطرت واقعات میں الجھایا گیا ہے بلکہ یہ ناول تین شوخ و شنگ بچوں ببلو، ٹیٹو، اور ککو کی معصوم شرارتوں کا پر لطف بیان ہے جو موسم گرما کی چھٹیاں تفریح میں بسر کرنے کے خواہش مند ہیں۔ بچوں کی فطرت میں شوخی، ظرافت کچھ نہ کچھ کرتے رہنے کا اضطراب، ہر بات کے بارے میں جاننے کا جذبہ، خودنمائی کی عادت اپنی چیزوں کو جمع کرنا اور ان کی حفاظت کرنا، بڑوں اور اپنے ہم عصر ساتھیوں کے ساتھ رہ کر کچھ نہ کچھ سیکھنا، ایک دوسرے سے مقابلہ اور باہمی ہمدردی کا جذبہ ہوتا ہے۔ ناول کے مرکزی کردار "تین اناڑی" یعنی تین معصوم بچے ان تمام فطری خوبیوں کے حامل ہیں۔ عصمت نے جس فطری انداز میں ان بچوں کے کردار پیش کیے ہیں۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ بچوں کی نفسیات پر ان کی گہری نگاہ رہی ہے اور وسیع مشاہدے نیز قوت متخیلہ کے حسین امتزاج سے اپنی تحریروں میں جان پیدا کر دیتی ہیں۔ انھوں نے بچوں کی فطری نشونما پر زور دیا ہے۔ انھیں خشک وعظ، پند و نصیحت، ہر وقت بچوں کو ڈانٹا ٹوکنا پسند نہیں اور اپنے ناول میں بھی انھوں نے ان باتوں سے گریز کیا ہے۔"

(ڈاکٹر خوشحال زیدی، اردو ادب اطفال میں خواتین کا حصہ، ناشر ادارہ بزم خضر راہ نئی دہلی، 2003، ص 53)

عصمت کی خوبی یہ ہے کہ وہ بچوں کے ادب کا ہیولی بھی عام زندگی کے مواد سے ہی تیار کرتی ہیں۔ جس طرح بالغوں کے لیے لکھے گئے ان کے فکشن میں کردار زندگی سے اٹھتے اور اپنے خصائص سمیت موجود ہوتے ہیں۔ یہی حال ان کے ذریعے بچوں کی خاطر لکھے گئے فکشن کا بھی ہے۔ بچے شرارتیں کرتے ہیں، روتے بلکتے ہیں، کلکاریاں مارتے ہیں، چیختے، دہاڑتے ہیں الغرض پورا بچپن ان کے یہاں متصور ہو جاتا ہے عصمت کی کہانیوں میں زبان کی وہی خوبیاں ہوتی ہیں جو ان کے عام افسانوں میں پائی جاتی ہیں۔ وہ اجٹ پن، ضدی مزاج بچپن کو بھی اپنی کہانیوں میں جگہ دیتی ہیں۔ 'سفید جھوٹ' کو بطور نمونہ دیکھا جا سکتا ہے اس میں سبق آموزی کا پہلو ہمیشہ سچ بولنے کا ہے لیکن اس پہلو کو وہ جھوٹ بولنے کے عواقب اور انجام سے ثابت کرتی ہیں وہ اس طور پر کہ کہیں سے بھی اندازہ نہیں لگایا جا سکتا ہے کہ یہاں سچ بولنے کی تلقین ہے وہ غلط تجربے سے درست رویے اور روش کی طرف رہنمائی کرتی ہیں۔ تصنع سے آزادی اور بے ساختگی پن بھی ان کے فکشن کے اطفال کا اہم وصف ہے۔

اردو فکشن کی روایت میں قرۃ العین حیدر ایک مینارہ بصیرت و بصیرت کی حیثیت رکھتی ہیں۔ انھوں نے اپنے عہد کے آشوب، رزمیے، بزمیے اور صدیوں کی تہذیبی زندگی کو فکشن کے چوکھٹے میں قید کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ قرۃ العین حیدر نے بچوں کے لیے براہ راست تخلیقی ادب خلق نہیں کیا نہ ہی طبع زاد ناول لکھے نہ ہی کہانیاں، انھوں نے بچوں کے لیے جو کچھ کیا ترجمے کے ذریعے کیا۔ روسی اور انگریزی ادب اطفال سے کئی کہانیاں، مضامین اور ناول کو اردو میں بازیافت کیا۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ انھوں نے معصوم قاری کو مدنظر رکھتے ہوئے اطفالی تخلیقات کو نئے سرے سے اطفالی فکشن کے طور پر خلق کیا ہم یہ اس لیے کہہ سکتے ہیں کہ ان کے ترجمے سے ترجمے کا تاثر ہرگز قائم نہیں ہوتا بلکہ ان پر طبع زاد تخلیق کا گمان گزرتا ہے۔

قرۃ العین حیدر کے ذریعے ترجمہ کیے گئے فکشن سے بچہ سوچ بچار کی تحریک پاتا ہے۔ اسے سائنسی فکر ملتی ہے۔ اپنے چاروں طرز پھیلی ہوئی کائنات کو تاکنے اور غور سے دیکھنے، آنکھوں سے ٹٹولنے کی ترغیب ملتی ہے بچہ بیک وقت کہانی کا لطف بھی حاصل کرتا ہے اور معلومات سے بھی ثروت مند ہوتا ہے۔ جن، حسن عبدالرحمٰن [ناول]، بھیڑیئے کے بچے، شیر خاں میاں، ڈھینچوں کے بچے، ہرن کے بچے، بہادر اور لومڑی کے بچے، عینی کی ترجمہ کی گئی ایسی تخلیقات ہیں جو بچوں کے ادب میں مترجم ادب کی حیثیت سے شاہکار کے طور پر پہچانی جاتی ہیں۔

واجدہ تبسم بھی اردو افسانہ نگاروں میں ایک بے باک افسانہ نگار کے طور پر جانی جاتی ہیں۔ حامد سراج لکھتے ہیں:

> "واجدہ تبسم کا شمار ان افسانہ نگار خواتین میں ہوتا ہے جنھوں نے زبان و ادب کی بے لوث خدمت کی یہ وہ قبیلہ ہے، جس کے باسی عام انسانوں سے بہت مختلف ہوتے ہیں۔ ان کی سوچ کے دائرے پیمائش کرنا ممکن ہی نہیں ہوتا۔ ان کے اندر آگ ہوتی ہے جسے انھیں لپیٹ کر کاغذ میں سمونا ہوتا ہے اور کاغذ کو راکھ ہونے سے بھی بچانا ہوتا ہے۔"

(محمد حامد سراج، واجدہ تبسم کا تخلیقی آسمان مشمولہ واجدہ تبسم: اذکار وافکار، عرشیہ پبلی کیشن دہلی 2014، ص 38)

واجدہ تبسم نے بچوں کے لیے بھی کہانیاں لکھیں۔ مزاحیہ فیچر اور معلوماتی مضامین تحریر کیے۔ واجدہ تبسم نے بچوں کے لیے جو دلچسپ کہانیاں لکھیں وہ کچھ اس طرح ہیں 'ہمارے چچا' (کھلونا 1956)، 'ہماری زندگی' (کھلونا اکتوبر 1957)، 'کہاں اور کیوں' (کھلونا فروری 1957)، 'مسٹر توڑ پھوڑ' (کھلونا جنوری 1958)، 'بچوں کا بادشاہ' (کھلونا اکتوبر 1958)، 'نیا نوکر' (کھلونا جنوری 1965)، 'چھپی ہوئی دولت' (کھلونا جنوری 1965) یہ کہانیاں اور فیچر واجدہ تبسم کے ادبِ اطفال سے شغف کی روشن دلیل ہیں۔ واجدہ تبسم نے بچوں کے لیے جو کچھ لکھا ہے اس میں گھریلو زندگی اور خانہ داری وغیرہ پر خاصی توجہ صرف کی ہے۔

جیلانی بانو بھی ہمارے عہد کی معروف فکشن نگار ہیں انھوں نے بڑوں کے لیے جو کچھ لکھا اس میں حیدر آباد کے نوابی کلچر کی زوال آمادہ جھلکیاں خوب ہیں اسی طرح بچوں کے لیے لکھے گئے فکشن میں مسلم معاشرت میں بگاڑ سے حفاظت کے لیے بے جا سختی وغیرہ کی جو صورتیں ملتی ہیں ان پر نہایت سلیقے سے تنقید کی ہے اور تنقید بچوں کے ذریعہ ہی کروائی ہے پھر اس کے مثبت نتیجے کو بھی دکھایا ہے۔ 'ایک نوع کی کہانی'، 'ایک دن کی بادشاہت' خاص دلچسپ ہے۔ 'چھوٹا سچ' (کھلونا اکتوبر 1958)، 'احمق پور کا احمق مند' (کھلونا فروری ۱۹۷۵ء)، بھی ان کی ایسی کہانیاں ہیں جو بچوں کے فکشن میں خاص اہمیت کی حامل ہیں۔

عطیہ پروین نے شعر و ادب کی متعدد جہتوں میں طبع آزمائی کی، ادب اطفال کو بھی کئی سمتوں سے ثروت مند کیا۔ متنوع موضوعات پر سینکڑوں کہانیاں، نظمیں، ڈرامے، مزاحیہ فیچرز اور ناولٹ جیسی مختلف اصناف میں انھوں نے ادب اطفال سے متعلق اپنی نگارشات پیش کیں۔ موضوعاتی تنوع، ادب اطفال سے مناسبت رکھنے والی زبان، عمدہ پیشکش اور اچھے اسلوب کا اہتمام ہمیں عطیہ پروین کے ذریعے تخلیق کردہ ادب اطفال میں ملتا ہے۔

بچوں کے لیے لکھی گئی عطیہ پروین کی تحریریں ہندو پاک کے مختلف رسائل و اخبارات میں شائع ہوئیں۔ پہلے پہل انھوں نے "کلیاں" نامی لکھنؤ سے شائع ہونے والے رسالے کے لیے لکھا بعد ازاں یہیں سے ان کی نگارشات کتابی صورت میں اشاعت پذیر ہوئیں۔ عطیہ پروین نے زبان اور پیش کش کے لیے اس طور کو اختیار کیا جو بچوں کے مزاج، ذہن اور دلچسپی سے ہم آہنگ ہونے کے ساتھ ساتھ زبان سکھانے اور لسانی مذاق سے آشنا کرنے میں ممد و معاون ہے۔ عطیہ پروین نے بیشتر ایسی تخلیقات وضع کیں جو نسائی مسائل کو موضوعِ بحث بناتی ہیں۔ بحیثیت ایک شاعرہ وادیبہ، عطیہ پروین نے غزلیں، نظمیں، نوحے، سلام اور مرثیے بھی لکھے۔

عطیہ پروین نے اپنے ادبی سفر کا آغاز بچپن میں کیا، اس لیے بچوں کے مسائل، ان کی ضروریات، دلچسپیوں، زبان و ترجیحات، سوچنے سمجھنے کے انداز کو برتنے اور زبان و اظہار میں ڈھالنے کی مشق اسی وقت سے ہوگئی اور عمر کی پختگی میں یہ وصف اور زیادہ نکھر کر سامنے آتا ہے۔

لطیفہ گوئی ادب اطفال میں ایک اہم صنف سخن ہے۔ بچوں کی سطح پر جا کر ان کے اندر مزاح پیدا کرنا اور اس طور سے لطیفے وضع کرنا کہ نہ صرف بچوں کو وہ سمجھ میں آئیں بلکہ انھیں گدگدانے اور ہنسانے میں کامیاب ہوں، اس لحاظ سے بچوں کے لیے لطیفے تیار کرنا آسان تخلیقی عمل نہیں ہے۔ عطیہ پروین نے اس صنف میں اچھے نمونے پیش کیے ہیں۔ بطور مثال ایک نمونہ ملاحظہ کریں:

"ننھا راجو، جو بہت پیارا اور بڑا عقلمند بچہ تھا ایسی ایسی باتیں کرتا کہ سن کر ہنسی بھی آتی اور حیرت بھی ہوتی کہ اس بالشت بھر کے گڈو میں کتنی سمجھ بھری ہوئی ہے۔ وہ اپنی کلاس روم میں پیاری پیاری باتیں کر کے نہ صرف اپنے ساتھیوں کو ہنساتا بلکہ کبھی کبھی ماسٹر صاحب کو بھی ہنسا دیتا۔ ایک دن ماسٹر صاحب نے پڑھاتے پڑھاتے بچوں سے پوچھا: "اچھا بچو! یہ بتاؤ کہ مکھی اور ہاتھی میں کیا فرق ہوتا ہے؟"

ایک بچے نے کہا: "ماسٹر صاحب، ہاتھی کے سونڈ ہوتے ہیں مکھی کے سونڈ نہیں ہوتے۔"

دوسرے بچے نے کہا: "ماسٹر صاحب مکھی کے پر ہوتے ہیں ہاتھی کے پر نہیں ہوتے۔"

تیسرا بچہ اچک کر بولا: "ماسٹر جی ہاتھی کے بڑے بڑے دانت اور بڑے کان ہوتے ہیں، مکھی کے نہیں ہوتے۔"

راجو یہ سب سنتا رہا پھر اپنی سیٹ سے اٹھا اور بولا:

"ماسٹر صاحب میں بتاؤں ہاتھی اور مکھی میں کیا فرق ہوتا ہے؟"

ماسٹر صاحب نے کہا: "ہاں ہاں ضرور بتاؤ کیا فرق ہوتا ہے؟"

راجو نے کہا مکھی اور ہاتھی میں سب سے بڑا فرق یہ ہوتا ہے کہ مکھی تو ہاتھی پر بیٹھ سکتی ہے لیکن ہاتھی مکھی پر نہیں بیٹھ سکتا۔"

آؤ ذرا ہنس لیں، عطیہ پروین، مشمولہ صدف اردو پرائمر حصہ دوم، مرتبہ ڈاکٹر خوشحال زیدی، نہرو چلڈرن اکیڈمی، نئی دہلی ص 26)

جس طرح مزاح بڑوں کے لیے ایک اہم صنف ہے اسی طرح بچوں کے لیے بھی مزاح کی بڑی اہمیت ہے۔ عطیہ پروین نے بچوں کے لیے مزاحیہ کردار بھی وضع کیے۔ امتیاز علی تاج کے کردار "چچا چھکن" کے نام کی طرح انھوں نے ایک کردار چچی چھمن کا وضع کیا اور اسے مرکز میں رکھ کر بچوں کے لیے کئی مزاحیہ تحریریں تیار کیں۔ جیسے چچی چھمن سے مشاعرہ سنا، چچی چھمن نے سنیما دیکھا، چچی چھمن حضرت گنج کی سیر کو گئیں وغیرہ۔ اس نوع کے عطیہ پروین نے قریب چالیس خاکے تحریر کیے۔

عطیہ پروین نے بچوں کے لیے جو نظمیں تحریر کیں وہ نظمیں زبان و بیان کے اعتبار اور اپنے موضوع و پیش کش کے لحاظ سے ادب اطفال کا بہترین نمونہ کہی جاسکتی ہیں۔ عطیہ کی ایک نظم "باجی چوہا" بچوں میں بہت مقبول ہوئی:

بچو، ایک موٹا سا چوہا　　بانو باجی کے گھر رہتا
بے حد پیٹو، بے حد پاجی　　عاجز اس سے بانو باجی
رہتا باورچی خانے میں　　چوری کرتا تھا کھانے میں
روٹی کترے سالن کھائے　　گھر کا ڈبہ بھی لڑھکائے
دال مسالہ منھ بھر کھاتا　　چاول اس کو بے حد بھاتا

(باجی چوہا، عطیہ پروین، مشمولہ بچوں کی نرالی دنیا، نئی دہلی، مئی 1999، ص 17)

ہم نے اس مثال میں دیکھا کہ ایک طرف عطیہ پروین نظم کا کردار ایسا چنتی ہیں جس سے بچوں کو دلچسپی ہو اور پھر اس کردار کے اوصاف کو اس طرح بیان کرتیں اور اس کی سرگرمیوں کا ایسا خاکہ کھینچتی ہیں کہ دلچسپی برقرار رہتی ہے اور تجسس بڑھتا جاتا ہے۔

بانو سرتاج بھی ادبی منظر نامے میں بحیثیت افسانہ نگار ایک اہم ستون کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ادب اطفال میں وہ کئی لحاظ سے اہمیت کی حامل ہیں وہ بچوں کی ناول نویس بھی ہیں افسانہ نگار بھی، مضمون نگار بھی اور ڈرامہ نگار بھی۔ بانو سرتاج کی ایک حیثیت ماہر تعلیم کی بھی ہے اس لحاظ سے وہ بچوں کی نفسیات کا تجربے اور فلسفے دونوں سطحوں پر گہرا شعور رکھتی ہیں بڑی عمر کے بچوں سے لے کر نونہالوں تک کی نفسیات حرکات وسکنات پر گہری نظر رکھتی ہیں۔ 'جنگل سے منگل' سے لے کر 'امی نا بولی' تک کی تحریروں کا جائزہ لیا جائے تو بچوں کی نفسیات پر ان کی گرفت کا درست اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ خوشحال زیدی لکھتے ہیں:

"بانو سرتاج نے بچوں کے لیے جو کچھ لکھا ہے وہ زبان و بیان اور موضوع بہرحال بچوں کا ہی ہے۔ انھوں نے ایسی تخلیقات بچہ بن کر ہی لکھی ہیں۔ ڈراما نویسی میں ان کو کمال حاصل ہے۔ ان کے ڈرامے ادب اطفال کے اردو ڈراموں میں خوشگوار اضافہ ہیں۔''

(ڈاکٹر خوشحال زیدی، اردو ادب اطفال میں خواتین کا حصہ، ناشر ادارہ بزم خضر راہ نئی دہلی، 2003، ص 95)

بانو سرتاج نے بچوں کے لیے جو کچھ لکھا ہے بہت ہی دلجمعی کے ساتھ اور فنی رکھ رکھاؤ کو ملحوظ رکھتے ہوئے لکھا ہے۔ بانو سرتاج کے ڈرامے ادبِ اطفال میں اپنی خاص شناخت رکھتے ہیں کہ بچے بآسانی انھیں کھیل

لیتے ہیں ڈراموں کے کردار بچوں کی نفسیات اور ان کے مکالمے بچوں کے محاورے اور لہجے سے طبعی مناسبت رکھتے ہیں۔ 'ایک بیمار سو انار'، 'مجھے شکایت ہے'، 'سچے کا بول بالا'، 'جب جاگے تبھی سویرا' ادب اطفال کے نمائندہ ڈرامے کہے جا سکتے ہیں۔ 'بوند کا سفر'، 'بے زبان ساتھی'، 'اچھا شکاری'، 'ایک بے وقوف کی کہانی'، 'اپنے لیے جیے تو کیا جیے' بانو سرتاج کی وہ نمائندہ کہانیاں ہیں جو بچوں کی نفسیات کا بہت باریک بینی سے مطالعہ کرتی اور بہت ہی مہارت سے ان کی قوت قصہ خوانی پر قابض ہو جاتی ہیں۔ وہ ان کہانیوں کو صرف پڑھتے ہی نہیں بلکہ خود سے ہی خود کو قصہ سناتے ہیں۔ بانو سرتاج نے ادب اطفال میں اب تک جو سرمایہ تیار کیا ہے وہ انھیں لازوال بنانے کے لیے کافی ہے۔

تحریر کا ماحصل یہ ہے کہ ہماری خواتین فکشن نگاروں نے ادب اطفال کی طرف خاطر خواہ توجہ دی اور ان کی یہ توجہ برائے توجہ نہ رہی بلکہ پوری سنجیدگی اور ذمہ داری سے انھوں نے بچوں کا ادب خلق کرنے کا فریضہ اپنے ذمہ لیا اور ادب اطفال کو کہانی، ڈرامے، ناول و ترجمے کی شکل میں لازوال تخلیقات عطا کیں، اس میں انھوں نے اپنی نسوانی مزاج اور نفسیات سے خوب استفادہ کیا اور خود کو 'ماں' کے مقام پر رکھ کر ادبِ اطفال کو تربیت کا زریں میدان بنایا اور اپنی لطافت سے بچوں کی سوچ و فکر پر خوب خوب اثر انداز ہوئیں۔ اسی لیے ان کے ذریعے تخلیق کردہ بچوں کے ادب کو بیش قیمت ادبی شہ پارہ قرار دینا عین انصاف ہے بلکہ اُن کے کردار و عمل کی صحیح عکاسی بھی۔□□□

Aisha zia

Ph.D scholar

Shipra Hostel, Room No- 57

JNU New Campus, South West

New Delhi-110067

Mob: 7011422975

Subscription Form "Mahnama Khwateen Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'ماہنامہ خواتین دنیا' کا/کی سالانہ خریدار بننا چاہتا/چاہتی ہوں۔

100 روپے کا ڈرافٹ/منی آرڈر.................................بتاریخ.......................................

بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرِتعاون سالانہ -/100 روپے IFSC:CNRB0019009، A/C: 90092010045326 میں جمع کروا دیا ہے۔

آپ 'ماہنامہ خواتین دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

پتہ : ....

....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون:011-26109746 فیکس:011-26108159, E-mail:magazines@ncpul.in

دستخط

بشیر شاہین

نصرت آرا چودھری
بحیثیت شاعرہ

ریاست جموں وکشمیر اردو زبان وادب کا گہوارہ رہی ہے۔ جموں وکشمیر ہندوستان کی وہ واحد ریاست ہے جس کی سرکاری اور عدالتی زبان اردو ہے۔ ریاست جموں وکشمیر اپنے قدرتی حسن، رعنائی اور فطرت کی جادوگری کی بدولت سارے عالم میں مشہور ہی نہیں بلکہ منفرد مقام ومرتبہ بھی رکھتی ہے۔ اردو کو سجانے اور سنوارنے میں یہاں کے ادیبوں شاعروں محققوں اور نقادوں نے جو کام انجام دیا ہے اس کو شاید ہی اردو ادب فراموش کر سکتا ہے۔ ریاست جموں وکشمیر کے ادبا، شعرا اور فنکاروں میں محمد دین فوق، پریم ناتھ پردیسی، سالک رام سالک، برج پریمی، حامدی کاشمیری پروفیسر ظہور الدین، پروفیسر امین اندرابی، پروفیسر زماں آزردہ، نور شاہ، وحشی سعید، آنند لہر، محمد یوسف ٹینگ، پروفیسر قدوس جاوید، شہ زور کاشمیری، ٹھاکر پونچھی، ترنم ریاض، فرید پربتی وغیرہ اہمیت کے حامل ہیں۔

جہاں تک نصرت چودھری کی شاعری کا تعلق ہے اگر ہم اس حوالے سے بات کریں تو یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ وہ ایک کامیاب شاعرہ کے طور پر ابھر کر سامنے آئیں۔ ان کا صرف ایک ہی شعری مجموعہ 'ہتھیلی کا چاند' ہے جو 2004 میں شائع ہوا اس مجموعے میں انھوں نے ریاکاری سے گریز کرتے ہوئے اشعار کو قلم بند کیا ہے اور بیشتر اشعار عورت کے کرب پر لکھے ہیں انھوں نے شاعری کی دنیا میں قدم اس وقت رکھا جب وہ گیارہویں جماعت کی طالبہ تھیں کسی ایک واقعے پر انھوں نے چند اشعار کہے گویا یہ ان کی پہلی کوشش تھی۔

نمونہ کلام:

جو بھی چہرے ہیں خون سے تر ہیں
ہر طرف غم زدہ سے پیکر ہیں

یہ شعر ان کے مجموعے کا پہلا شعر ہے جسے انھوں نے ان حالات میں لکھا جب کشمیر میں خون کی ندیاں بہہ رہیں تھیں، انسان انسان کے خون کا پیاسا تھا، ظلم وزیادتی میں دن بدن اضافہ ہو رہا تھا، لوگوں کا جینا محال ہو گیا تھا، شعر کا پہلا مصرعہ ''جو بھی چہرے ہیں خون سے تر ہیں'' جہاں تک

میری نظر جا رہی ہے ہر طرف لوگوں کے چہرے خون آلودہ ہیں آخر کیوں لوگوں کے چہرے مرجھائے ہوئے ہیں؟ کیوں لوگ پریشانی کے عالم میں مبتلا ہیں؟ گویا انھوں نے اس شعر میں جموں وکشمیر کے حالات کی عکاسی کی ہے اور وہ ان حالات کو بخوبی جانتی تھیں جب نہ صرف کشمیر بلکہ جموں کے چند اضلاع میں بھی ظلم وزیادتی کا بازار گرم تھا اور عوام ذلت ومجبوری کی زندگی جینے پر مجبور تھے ان تمام باتوں کو نصرت نے اپنے اندر محسوس کیا اور تب انھیں اشعار کے سانچے میں ڈھالا۔ ان کا ایک شعر ملاحظہ ہو:

ہر اک سے سمجھوتہ کرو گے تو شاید بچ پاؤ گے
میری طرح دنیا میں ورنہ تم بھی دھوکا کھاؤ گے

جب ہم غزل کے موضوعات کو ذہن میں رکھتے ہیں تو تین باتیں ہمارے سامنے آتی ہیں جن میں حسن عشق اور آزادروی شامل ہیں۔ شروع میں غزل کا خاص موضوع عشق حقیقی اور تصوف رہا ہے لیکن رفتہ رفتہ اس میں تبدیلیاں رونما ہوتی گئیں اور نئے خیالات واحساسات زمانے کے دکھ درد جیسے واقعات کو غزل کے موضوعات میں برتا گیا۔ تصوف کے موضوعات کے بارے میں کہا گیا ہے کہ "برائے شعر گفتن خوب است"، لیکن یہ بات کسی حد تک درست نہیں جہاں تک صوفیائے اکرام کا تعلق ہے تو انھوں نے اپنی زندگی میں ہونے والے واقعات کو غزل میں پیش کیا ہے لیکن آج کے شعرا غزل میں حیات وکائنات میں رونما ہونے والے مسائل کے بارے میں اپنے نظریات پیش کرتے ہیں۔ نصرت آرا نے بھی کے موضوعات پر اشعار قلم بند کیے ہیں مثال کے طور پر چند اشعار پیش خدمت ہیں:

میرے ہونٹوں پر کوئی حرف شکایت ہی تھی
کام میرے تو کب آیا ہے خدا ہوتے ہوئے

☆

نہ جانے کب سے میری ذات میں مقید ہے
خدا کا شکر ہے اب تک وہ ذات باقی ہے

☆

زمانے بھر میں میں بدنام ہو گئی اللہ
میں کیا کروں تیرے در سے وحی نہیں آتی

نصرت چودھری کی غزلوں میں چند ایسے اشعار ملتے ہیں جن کے پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ سماج کی سچائی اور رشتوں کے تانے بانے ایسے موضوعات ہیں جو سوچنے پر مجبور کر دیتے ہیں کہ نصرت چودھری نے اپنے غموں کو شعر کے سانچے میں ڈھال کر عام آدمی کے سامنے پیش کرنے کی سعی کی ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار سے اُن کے عشقیہ جذبات واحساسات کا پتا چلتا ہے:

بدل ہی جاتا میری زندگی کا مقصد بھی
تمھارے پیار کا مجھ کو جو آسرا ہوتا

☆

اک لمحہ جو عبارت تھا کسی کے پیار سے
آنسوں کی چھاؤں میں کروٹ بدل کر سو گیا

☆

تمھیں نے مجھ کو محبت کی انتہا سمجھا
تمھیں نے میری محبت کو خام لکھا ہے

نصرت چودھری نے جس طرح اپنے جذبات کی عکاسی اپنی شاعری میں کی ہے اور سماج کے اندر عورت ذات کی بے حرمتی، اُس کی بے بسی، سسکیاں اور اُس کے احساس میں پیدا ہونے والی رکاوٹیں جو اس دُنیا میں ایک عورت پر آئے دن رونما ہوتی ہیں اگر چہ ایک عورت (ماں، بیٹی، بہن اور بیوی) جیسے عظیم رشتوں کو نبھاتی ہے پھر بھی اُس کے ساتھ انصاف نہیں ہو پاتا اور مردوں کے بنائے گئے رسم ورواج کے طور طریقے اُسے جینے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ بقول نصرت چودھری:

دُکھ دیتے دیتے اہل جہاں مجھ کو تھک گئے
اپنے غموں پہ اس لیے ہنستی رہی ہوں میں

یہ سچ پوری عمر ہی پیاسی رہی ہوں میں
پیاسے دلوں کے واسطے ندی رہی ہوں میں
(ص۔62)

غم کی سلگتی اس آندھی میں ساتھ نہ ہوگا کوئی
سوکھا ہوا اک پتہ بن کر شاخ سے نیچے آ وگے
(ص۔60)

سلگ رہی ہوں ازل سے مگر ہیں لب خاموش
(ص۔70)

کسی کا خیال آ یا ہے مجھ کو
سمٹ آ ئی ہیں رعنا ئیا ں سی
☆
ان ہی میں ڈوب کر اُبھروں گی نصرت
مقدر میں ہیں کچھ گہرائیاں سی
(ص۔75)

☆

سیاسی، سماجی، اخلاقی اور مذہبی طور پر اُس کے ساتھ بے جا رویہ برتا جا رہا ہے۔ عورت نے اگرچہ سماج کے حوالے سے تمام رشتوں کو نبھایا لیکن پھر بھی سماج میں عورت کو کم تر سمجھا جاتا رہا۔ انہی باتوں کو نصرت چودھری اپنی غزلوں میں پیش کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔

نصرت چودھری اپنی شاعری کے ذریعے عورت ذات کو یہ پیغام دینا چاہتی ہیں کہ عورتوں کو چاہئے کہ حالات جس طرح کے بھی پیدا ہوجائیں انھیں کبھی ناامید نہیں ہونا چاہیے۔ ہمت اور حوصلے سے کام لینا چاہیے زمانے کے آگے جھکنے اور حالات کی بھٹی کا ایندھن بننے کے بجائے حالات کو اپنے موافق کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ یہ رسم ورواج، بندشیں اس دنیا میں صرف عورتوں کے لیے ہیں مردوں کے لیے نہیں۔ زندگی ایک کشمکش کا نام ہے اور اسی کشمکش میں زندگی کا اصلی مزہ بھی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

ہوں زندگی میں کیسے حقیقت سے آ شنا
خوابوں کے آسمان پہ جو سوتے رہے ہیں لوگ
☆
زندگی سے وقت کچھ ملتا تو میں بھی گھر سے باہر دیکھتی
رات بھر زنجیر سے لٹکے ہوئے چہروں کے خنجر دیکھتی
☆

زندگی کی قید سے آزاد نصرت جب ہوئی
میرے قاتل اور ستم گر سو گئے
☆
کچھ اور زندگی سے مراد تو نہیں
تجھ سے ملوں یہ سوچ کے جیتی رہی ہوں میں

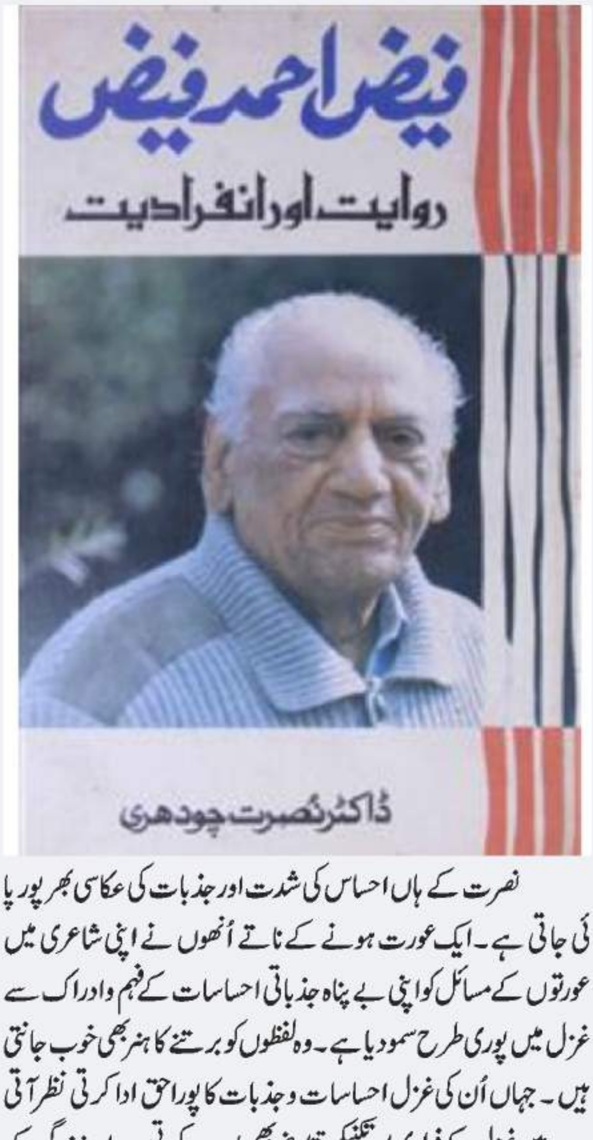

نصرت کے ہاں احساس کی شدت اور جذبات کی عکاسی بھرپور پائی جاتی ہے۔ ایک عورت ہونے کے ناتے اُنھوں نے اپنی شاعری میں عورتوں کے مسائل کو اپنی بے پناہ جذباتی احساسات کے فہم وادراک سے غزل میں پوری طرح سمو دیا ہے۔ وہ لفظوں کو برتنے کا ہنر بھی خوب جانتی ہیں۔ جہاں اُن کی غزل احساسات وجذبات کا پورا حق ادا کرتی نظر آتی ہے وہیں غزل کے فطری اور تکنیکی تقاضے بھی پورے کرتی ہے اور زندگی کے ویران لمحوں کو غزل میں پوری طرح سمو دینے کا ہنر اچھی طرح جانتی ہیں۔

ان کے شعری مجموعے "ہتھیلی کا چاند" کے زیادہ تر اشعار میں آج کی عورت کے دُکھ درد کے کسی نہ کسی پہلو کو پیش کیا گیا ہے۔ لیکن عورت کا یہ دُکھ جسمانی یا معاشی محرومیوں کا نہیں بلکہ روحانی اور نفسیاتی، نا آسودگی اور جذباتی وحسیاتی زخم خوردگی کا کرب ہے

آواز جس کی گونج رہی ہے فضاؤں میں
میں اس کو یاد کرتی ہوں اکثر دعاؤں میں
☆
زمانے بھر میں ، میں بد نام ہو گئی اللہ
میں کیا کروں تیرے در سے وحی بھی نہیں آتی
☆
دُکھ دیکھ میرا تجھ کو اگر کچھ دکھائی دے
نا دیدہ غمزدوں کی نہ مجھ کو دہائی دے
☆
اپنے دکھوں کا کرنے چلی ہوں جو میں حساب
دیکھوں جدھر بھی خون کا دریا دکھائی دے

نصرت چودھری خود ایک عورت ہیں اس لیے اِن کے یہاں عورت کے کرب کا اظہار پایا جاتا ہے۔ شخصی کرب کا اظہار ہو، یا ذاتی لیکن اندازِ بیان ایسا ہے کہ ذات کا کرب کائنات کے کرب کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ نصرت کی غزلوں کی زبان بھی سادہ اور عام فہم ہے۔ اسی لیے شعر کی صورت میں ان کی باتیں براہ راست قاری کے دل میں اُتر جاتی ہیں۔

اس اعتبار سے نصرت چودھری کشمیر کی ایک ایسی جدید تر شاعرہ ہیں جنھیں ہندوستان اور پاکستان کی نمائندہ اُردو شاعرات کے تقابلی مطالعے میں رکھا جائے تو اس کی انفرادیت کا سچا اندازہ ہوگا۔

نصرت چودھری کی غزلیات میں عورت کے جذبات واحساسات کی داخلی کیفیات بھرپور انداز میں ملتی ہے۔ نسوانیت کے کئی پہلوؤں کو انھوں نے اپنی غزلوں میں نئے انداز سے پیش کیا ہے۔ ان کے یہاں عورت کے عشق و محبت کی ایسی بھرپور ترجمانی ملتی ہے جو اپنے عاشق کی جدائی میں محبوبہ پر گزرتی ہے۔ نصرت آرا ان جذبات کو اشعار کے پردے میں یوں بیان کرتیں ہیں:

مجھے چھو کر وہ غائب ہو گیا ہے
یہ منظر جاگتے میں خواب سا ہے
☆
تم سے بچھڑ کر وہ روتا ہو
شاید تم کو اندازہ ہو
☆
دیس پرائے وہ جا بر سے
گھر گھر آئے روز ہی بادل

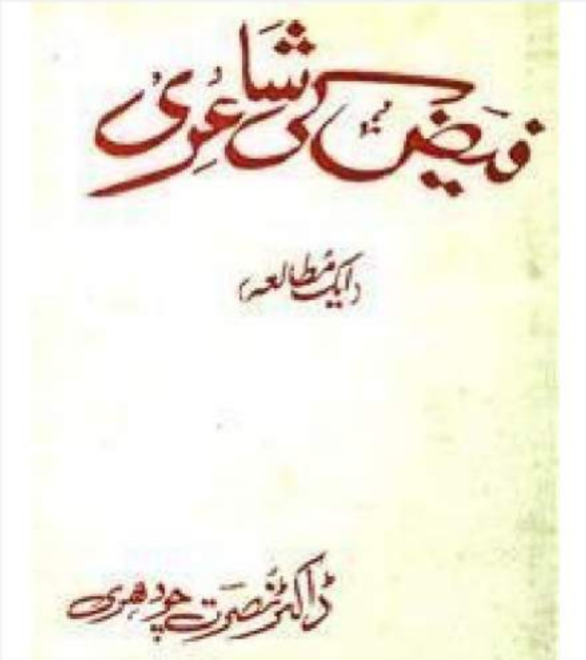

اُن کی شاعری کے بیشتر حصے میں ایک عورت کا کرب ہے، دکھ ہے۔ جو کسی فلسفۂ حیات کی نقیب نہیں بلکہ ایک سیدھی سادھی عورت کے دل کی پکار ہے۔ انھوں نے اپنی غزلوں میں تشبیہات و استعارات کا استعمال بھی کیا ہے لیکن اس طرح کہ آسانی کے ساتھ سمجھا جا سکے۔ انھوں نے شاعری کی تمام تر اصطلاحوں کو اپنی شاعری میں استعمال کیا ہے جو غزل کے لیے خاص سمجھی جاتی ہیں۔

نصرت آرا چودھری نے جس طرح اپنی غزلوں میں ذاتی مشکلات، عصری مسائل، عشقیہ موضوع، سیاست، خواب، ماضی کی بازیافت اور تہذیب و معاشرت کی عکاسی کی ہے وہ قابل مطالعہ ہے۔

مختصر طور پر کہا جاسکتا ہے کہ نصرت آرا جدید دور کی شاعرات میں بلند مقام رکھتی ہیں۔ خصوصاً صوبہ جموں وکشمیر کی خواتین شاعرات میں اُن کا اہم نام ہے۔ جنھوں نے اپنی شاعری کے ذریعے عورتوں کے احساسات و جذبات کو پیش کیا ہے۔ نصرت کی شاعری میں بغاوت بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔

□□□

Bashir Shaheen
Room No. 52 A
Gwyer Hall Hostel
Dept. of Urdu
University of Delhi
Delhi-110007

زرین فاطمہ

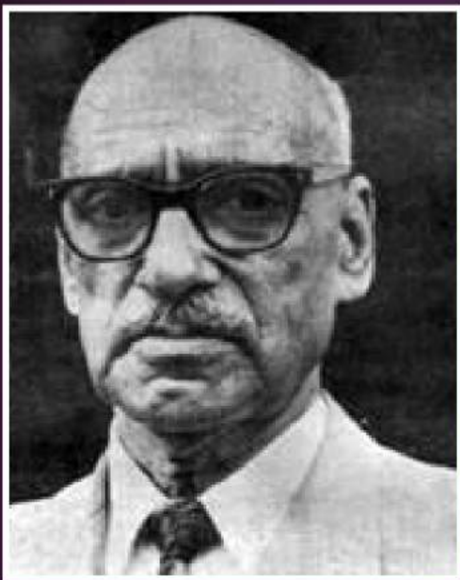

ڈاکٹر عندلیب شادانی کی شعری کائنات

ڈاکٹر عندلیب شادانی کا شمار اردو اور فارسی ادب کے ممتاز محقق، شاعر اور افسانہ نگار کی حیثیت سے ہوتا ہے۔ ان کا تعلق اتر پردیش کے مشہور شہر سنبھل سے تھا جو بڑا مردم خیز شہر اور علم و ادب کا گہوارا ہے اور وہاں کے شعراء و ادباء نے اردو ادب کا عظیم سرمایہ یادگار چھوڑا۔ انھیں میں عندلیب شادانی کا بھی شمار ہوتا ہے۔

شادانی صاحب کا نام وجاہت حسین تھا۔ ان کی ولادت 1904 میں سنبھل کے محلّہ محمود خاں سرائے کے ایک متوسط گھرانے میں ہوئی تھی۔ والد کا نام اشتیاق حسین تھا جن کا مشغلہ تجارت تھا۔ والدہ کا نام زینب بی بی تھا جن کا تعلق رامپور سے تھا۔ عندلیب صاحب کا بچپن اپنے ننہال رامپور میں گزرا۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی اور رامپور سے ہائی اسکول پاس کیا۔ مزید تعلیم کے حصول کے لیے مراد آباد اور بریلی کالج میں داخلہ لیا۔ اس کے بعد اپنے ننہالی شہر کی طرف طبعی میلان ہونے کی وجہ سے وہاں کے 'مدرسۃ العالیہ' میں داخلہ لیا اور فاضل کی سند حاصل کی۔ اس کے بعد وہ لاہور چلے گئے جہاں سے انھوں نے تاریخ میں ایم اے پاس کیا۔ اس کے بعد لندن یونیورسٹی سے ''ہندوستان کے مسلم مؤرخ'' کے موضوع پر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ اپنے شیریں بیانی سے محفلوں پر چھا کر سرمستی و سرشاری کی کیفیت طاری کرنے والے بہترین اور عظیم شاعر، نقاد، محقق ڈاکٹر عندلیب شادانی 26 جولائی 1949 کو اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔ انھوں نے ڈھاکہ میں وفات پائی اور وہیں سپردِ خاک ہوئے۔

عندلیب شادانی کو شاعری کا شوق بچپن سے ہی تھا۔ ان کو اردو کے

علاوہ فارسی میں بھی شعر کہنے کا ملکہ حاصل تھا۔ان کی شاعری کا باقاعدہ آغاز 1924 سے ہوا جب وہ لاہور میں قیام پزیر تھے۔

عشق سے ہوتا ہے آغاز حیات
اس سے پہلے زندگی الزام ہے

وہ لکھتے ہیں:

''شاعری سے ذوق چھوٹی عمر میں پیدا ہو گیا تھا۔جس میں اپنے وطن کے ماحول کو بڑا دخل ہے۔اس زمانے میں سنبھل ،ضلع مرادآباد میں اکثر طرحی مشاعرے ہوا کرتے تھے۔میں بھی ان مشاعروں میں شرکت کرتا تھا۔کم عمری میں اس طرح کے ایک طرحی مشاعرے میں چند اشعار بھی کہے تھے۔جو محفوظ نہ رہ سکے۔پھر ریاست رامپور کے زمانہ طالب علمی میں بھی یہ شغل جاری رہا۔اس وقت باقاعدہ شاعری تو نہ کرتا تھا۔مگر اس زمانے کے اشعار سے اتنا اندازہ تو ضرور ہو گیا کہ شاعری کے لیے طبیعت موضوع پائی ہے۔''

عندلیب صاحب،شاداں بلگرامی صاحب سے اتنے متاثر ہوئے کہ انھوں نے اپنے نام کے ساتھ ان کے نام کا جز شاداں کا اضافہ کر کے خود کو شادانی کر لیا جو ہمیشہ کے لیے ان کے نام کا حصہ بن گیا اور وہ وجاہت حسین عندلیب شادانی ہو گئے۔

رامپور سے انھیں علمی وادبی ماحول ملا تھا۔جس کی وجہ سے انھوں نے گیارہ سال کی عمر میں ہی ایک غزل لکھی تھی اور مشاعرے میں بھی پڑھی تھی جس پر کافی داد ملی۔اس کے بعد انھوں نے باقاعدہ طور پر شاعری شروع کر دی 1924 میں لاہور کے دیال سنگھ کالج میں ''بزم ادب'' کے مشاعرے میں ''تصویر بہار'' کے عنوان سے نظم پیش کی جس کی وجہ سے انھیں خاص مقبولیت حاصل ہوئی اس کے بعد ان کی دوسری نظم ''شالا مار'' منظر عام پر آئی عندلیب شادانی ایک مشہور غزل گو شاعر تھے۔لیکن انھوں نے اپنی شاعری کی ابتدا غزل کے بجائے نظم سے کی۔جب ہم ان کی نظموں کا مطالعہ کرتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی نظموں پر بھی غزل کے اثرات نمایاں ہیں۔نظم کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

گیا خزاں کا دور جاں گزاں بہار آ گئی
چمن کی روح رفتہ لو پھر ایک بار آ گئی

پھر عندلیب خوش نوا،چمن میں ہے غزل سرا
روش روش یہ پھر گلوں کھیلنے لگی صبا

اگا ہے سبزہ اس قدر کہ ہے زمرّ دیں زمیں
جدھر نظر اٹھایئے بچھا ہے فرش مخملیں

کچھ ایک بوستاں کے صحن ہی پہ منحصر نہیں
رہے بہارا ذرّہ ذرّہ خاک کا ہے عنبریں

عندلیب صاحب کی شاعری میں رواں دواں الفاظ شائستگی وصفائی ،ترتیب وتشکیل،عنایت ورومانیت عزم وحوصلہ،اسلوب بیان کی ندرت، جذبات نگاری ،داستان ،حسن وعشق ،منظر نگاری ،کنایہ،تشبیہ ،استعارہ ،معاملہ بندی،اور لہجہ کی انفرادیت کے عمدہ نمونے ملتے ہیں۔

ڈاکٹر عندلیب شادانی کا شعری مجموعہ ''نشاط رفتہ'' 1951 میں پنجاب سے شائع ہوا اس سے پہلے ان کے اشعار رسائل وجرائد میں شائع ہوئے تھے ان کی شاعری کے دو دور تھے۔پہلا دور جنوری 1924 سے اگست 1929 تک اور دوسرا دور جولائی 1934 تک دسمبر 1931 میں ایک نظم ''سی نوری تا'' لندن میں کہی پھر شاعری ترک کر دی۔1934 میں ان کا شاعری کا ذوق ابھرا اور یہ غزل کہی۔

گزاری تھیں خوشی کی چند گھڑیاں
انھیں کی یاد میری زندگی ہے

عندلیب صاحب کی شاعری میں دہلی اور لکھنؤ کی شاعری کے اثرات بھی نمایاں ہیں ان کی شاعری میں کلاسیکی اور رومانی رجحان نظر آتا ہے۔

مجھے الزام نہ دے ترک شکیبائی کا
مجھ سے پوشیدہ ہے عالم تیری رعنائی کا

نہ سنو قصہ ناکام محبت نہ سنو
ہے یہ وہ خواب جس کی کوئی تعبیر نہیں

شادانی صاحب کی شاعری واردات قلبی پر مشتمل ہے وہ ایک رومان پرور شاعر تھے۔ان کی پوری شاعری پر رومانی فضا چھائی ہوئی ہے۔ان کی شاعری میں حسن پرستی موجود ہے۔ان کا محبوب حسن وجمال کا رسیا ہے۔محبوب کے حسن وجمال کو وہ اس طرح ظاہر کرتے ہیں:

ہائے وہ کیف در آغوش غزالی آنکھیں
ہائے وہ حسن کی تقدیر مثالی گردن

عندلیب صاحب کی شاعری واردات قلبی پر مشتمل ہے۔ان کی شاعری سے یہ گمان ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے جذبات کو اپنی شاعری میں واضح کیا ہے۔اس سلسلہ میں وحشت کلکتوی لکھتے ہیں کہ:

''ان کے اشعار میں بہت سے لوگوں کو اپنے دل کی دھڑکن
سنائی دے گی''

شادانی صاحب کی شاعری میں انسانی نفسیات (حسن وعشق) کا شیریں انداز بھی کارفرماں نظر آتا ہے۔ان کے بیشتر اشعار میں دلی احساسات غالب ہیں۔اس کے باوجود بھی وہ اپنے شعور سے بہرامند ہیں انھوں نے نہ صرف محبت کی بلکہ محبت کے پوشیدہ رازوں کو جاننے اور سمجھنے کی کوشش بھی کی ہے۔اس سلسلے میں وہ بہت کامیابی کے ساتھ ذمہ دار ثابت ہوئے۔ان کے یہاں حسن وعشق کا دلکش انداز دیکھنے کو ملتا ہے:

تم پاس ہو اور دل کا یہ عالم ہے توبہ
یہ حال تو جب دور تھے تب بھی نہ ہوا

یہ جانتا ہوں کہ میں تجھ کو پا نہیں سکتا
ہر ایک سانس میں بڑھتی ہے آرزو تیری

شکریہ پرسش غم کا مگر اصرار نہ کر
پوچھنے والے یہ تیرا کہیں راز نہ ہو

عندلیب صاحب نے اپنی غزلوں میں جن موضوعات کو پیش کیا ہے۔اس پر ان کی آپ بیتی کا اطلاق ہوتا ہے۔ان کی غزلوں کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا ہر شعر ان کے جذبات کی عکاسی کر رہا ہے:

زخم دل کے چھپا رہا ہوں میں
کوئی میری ہنسی کو کیا جانے

کسی کی مجال تھی کہ حجاب نظر اٹھائے
وہ مسکرائے آپ ہی دل کے قریب آئے

اک دل نشین نگاہ میں اللہ یہ خلش
نشتر کی نوک جیسے کلیجے میں ٹوٹ جائے

شادانی صاحب نے اپنی بیشتر غزلوں میں تسلسل کا خاص خیال رکھا ہے۔انھوں نے اپنی غزلوں میں مقطع کا اہتمام نہیں کیا'نشاط رفتہ' میں جو مسلسل غزلیں ہیں وہ تخیل حسن وبیان رعنائی و دلکش کی صورت ہیں۔

مسلسل غزل کے چند اشعار:

شوق کی رات ہے ناز کی رات ہے
اور تصویر سے چاندنی رات ہے

نغمہ ہے چاندنی یا وہ ہے چاندنی
آج طوفان جذبات کی رات ہے

غم کدہ پھر شبستان عشرت بنا
چاند نکلا تو پھر چاندنی رات ہے

عندلیب صاحب کی شاعری کی ایک نمایاں خوبی یہ بھی ہے کہ انھوں نے اپنی شاعری میں چاند کا لفظ بار بار استعمال کیا ہے۔اس وجہ سے انھیں مہتابی شاعر کہا جاتا ہے۔شادانی صاحب نے مہتابی شاعری کے ذریعے اپنے نفسیاتی جذبات اور قلبی واردات کا بیان پر اثر انداز میں بیان کیا ہے۔چاند کی حقیقت جاننے کے باوجود وہ چاند کو ہی اظہار جذبات کا ذریعہ بتاتے ہیں۔کیونکہ چاند سے ان کی یادیں وابستہ ہیں۔

ہنستی آنکھیں ہنستا چہرہ ایک مجبور بہانہ ہے
چاند میں سچ مچ نور کہاں ہے چاند تو اک دیوانہ ہے

مہ تمام سے یادیں ہیں کتنی وابستہ
مہ تمام کو مسرت سے دیکھتا ہوں میں

عندلیب صاحب کو فی البدیہہ اشعار کہنے میں ملکہ حاصل ہے۔یہ ان کی وہ خوبی ہے جو ان کو دیگر شعرا میں ممتاز بناتی ہے۔لیکن انھوں نے کبھی اپنی اس خوبی کو اہمیت نہیں دی۔اس لیے انھوں نے اپنے فی البدیہہ اشعار کو'' نشاط رفتہ'' میں شائع نہیں کیا۔چنانچہ ان کے فی البدیہہ اشعار کو ''پروفیسر نظیر صدیقی'' نے اپنی کتاب میں ''ڈاکٹر عندلیب شادانی ایک مطالعہ''میں شائع کیا ہے۔

چند فی البدیہہ اشعار ملاحظہ فرمائیں

کارواں جا بھی چکا ہائے میری سادہ دلی
میں ابھی منتظر بانگ درا بیٹھا ہوں

اتنے بیزار کیوں یہ وہی نقش ہیں
آپ کے دل پہ جو سب سے پہلے بنا

شادانی صاحب کی ایک اہم خوبی یہ ہے کہ وہ اردو کے ساتھ ساتھ فارسی میں بھی دلکش شعر کہتے تھے۔

آواز چو بجوانی یا نغمہ سرائی
مانند نوک پیکا در سینہ می در آئی

عندلیب صاحب کی شاعری کی ایک خصوصیت معاملہ بندی بھی ہے۔

تصویر میں نے مانگی تھی شوخی تو دیکھئے
ایک پھول اس نے بھیج دیا ہے گلاب کا

عندلیب صاحب کی شاعری میں مکالماتی انداز بھی دیکھنے کو ملتا ہے جو مخاطب کو دلکش انداز میں اپنی طرف متوجہ کرتا ہے:

لو جاؤ کہہ کہ پھر دامن نہ چھوڑنا
کہنا پھر آہ بھر کے مگر بھولنا نہیں

اللہ بولتے نہیں تو مسکرا ہی دو
میں کب سے منتظر ہوں تمھارے جواب کا

ان کی شاعری میں تحیر اور تعجب بھی نظر آتا ہے

اللہ وہ قربت کے لمحے دل کا یہ عالم تھا جیسے
پھولوں کی جوانی میری ہے تاروں کا تبسم میرا ہے

عندلیب صاحب کی شاعری میں صاف ستھرا اور سنبھلا ہوا انداز پایا جاتا ہے جسے وہ بڑی پاکیزگی کے ساتھ بیان کرتے تھے۔ ان کی شاعری میں سلاست و سادگی پائی جاتی ہے۔ انھوں نے صاف شائستہ اور رواں زبان استعمال کی ہے۔ ان کا یہی انداز ان کے کلام میں حسن و دلکشی پیدا کر دیتا ہے:

چاندنی اور اداس تنہائی
تم ہو کس حال میں خدا جانے

شادانی صاحب کے یہاں محبوب سے بے نیازی اور بے وفائی کا جو گلہ ملتا ہے وہ حقیقتاً نہیں ہے بلکہ وہ عشق و محبت کے جذبات پر مبنی ہے۔ محبوب سے شکوہ کرتے وقت ان کا لہجہ نرم و ملائم ہوتا ہے۔

کیا کروں آہ بھلایا نہیں جاتا مجھ سے
وہی پیمان محبت جو تمھیں یاد نہیں

شادانی صاحب نے اپنی شاعری میں نہایت شریں و لطیف الفاظ استعمال کیے ہیں۔ وہ مبہم الفاظ کے استعمال سے گریز کرتے تھے۔ انھوں نے اپنی شاعری میں تراکیب کا بھی بڑا برجستہ استعمال کیا ہے۔ انھوں نے نئی نئی اور لطیف تراکیب سے اپنی شاعری کو دلکش انداز میں مزین کیا ہے۔ شادانی صاحب نے اپنی شاعری میں بلاشبہ تشبیہ، استعارہ، کنایہ، حسن تعلیل اور صنائع بدائع وغیرہ کا بھی استعمال کیا ہے۔

آغا شیدا کاشمیری لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر شادانی عاشقانہ شاعری کے دلدادہ ہیں یہ رائے ''نشاط رفتہ'' کے مطالعہ کے بعد میں نے قائم کی ہے اور یہ کوئی بری بات بھی نہیں ہے میرے خیال میں وہ شاعر ہی نہیں جو عاشق نہیں''

پروفیسر نظیر صدیقی کیں نزدیک

''شادانی کی تصانیف میں ''نشاط رفتہ'' گل سرسید کی حیثیت رکھتی ہے''

حواشی

1۔ نشاط رفتہ، ڈاکٹر عندلیب شادانی، تعارف سن 1951
2۔ تذکرہ شعراء اتر پردیش، حصہ دوم۔ صفحہ 242، اشاعت اول 1982، نظامی پریس لاہور
3۔ آزادی سے قبل اردو تحقیق، ڈاکٹر محمد اکمل، صفحہ ۱۵۵۔ مطبع ایچ ایس پرنٹرنئی دہلی۔ ایڈیشن 2013
4۔ میری زمین کے چاند ستارے، تذکرہ شعراء سنبھل (جلد اول) ڈاکٹر کشور جہاں زیدی، صفحہ 15، 16، سن اشاعت 2016، حامدی پرنٹ پوائنٹ دہلی 25۔
5۔ ''نصرت'' ہفت روزہ صفحہ 16۔ سن اشاعت 30 ستمبر 1916 لاہور
6۔ ڈاکٹر عندلیب شادانی شخصیت و فن، اشتیاق احمد، صفحہ 94، 2004۔ پنجاب یونیورسٹی لاہور
7۔ میزان شعر، شیدا کاشمیری، ص 303، دسمبر 1956 لاہور
8۔ مکاتیب وحشت بنام ڈاکٹر عندلیب شادانی (وحشت نمبر)، ص 101۔ ستمبر 1952 کراچی
9۔ بیاض سخن، عندلیب شادانی، غیر مطبوعہ
10۔ ڈاکٹر عندلیب شادانی حیات و کارنامے، ڈاکٹر کلثوم ابو البشر، ص 156، 1992
11۔ ڈاکٹر عندلیب شادانی ایک مطالعہ، نظیر صدیقی، ص 53

□□□

Zarrin Fatima
Teemar Das Sarai
Near Junior High School
Urdu Ghar
Sambhal-244302 (U.P)
Mob: 9759817231

شہناز فاطمہ صدیقی

غزلیں

سانس کی ڈور سے بندھے نکلے
مختصر سارے رابطے نکلے

رات گزرے ترے خیالوں میں
اور دن تجھکو سوچتے نکلے

تھی مقابل میں الجھنیں لیکن
خود کلامی سے مشورے نکلے

ہم نے دیکھا ہے آزما کہ اسے
نام سے اچھے ذائقے نکلے

اک تغافل سے آشنائی ہوئی
خود شناسی کے راستے نکلے

ایک تھی راہ دونوں کی لیکن
پھر الگ ان کے زائچے نکلے

رچا نہ ڈھونگ، اداکاریوں سے کام نہ لے
ہوا کے شہر میں چنگاریوں سے کام نہ لے

نکل بھی جاتے ہیں آسانیوں سے کام یہاں
صراط دل ہے یہ، دشواریوں سے کام نہ لے

کسی کسی کو میسر ہے خوش بیانی یہاں
تجھے ملی ہے تو بے زاریوں سے کام نہ لے

بہت ضروری ہے نادانیاں محبت میں
ہمیشہ صرف سمجھداریوں سے کام نہ لے

چھپی ہوئی ہے پرت در پرت تری الفت
ہمارے ساتھ یوں تہہ داریوں سے کام نہ لے

Shahnaz Fatma Siddiqui
293/57-D
OLD HAIDER GANJ
LAKARMANDI,
LUCKNOW-226003 (UP)
Mobile No. 9026933788

شبانہ عشرت

نظمیں

* میں تو آواز ہوں *

میں تو آواز ہوں
آواز ہی رہنے دو مجھے
کوئی پیکر نہ تراشو
کوئی صورت نہ گڑھو
مجھ کو ایوان حکومت کا بھی قیدی نہ کرو
میں تو آزاد ہوں صدیوں سے
زمانے والو
کوئی سرحد، کوئی دیوار نہ بانٹے مجھ کو
گونج اٹھتی ہوں میں زِنداں میں بلاخوف وخطر
بول اٹھتی ہوں میں زنجیروں کی جھنکاروں میں
میں تو آواز ہوں
آواز ہی رہنے دو مجھے
میں نے آواز اُٹھائی ہے سدا ظلمت کے خلاف
میں نے صدیوں کی غلامی سے دلائی ہے نجات
دور تک پھیلی اندھیروں میں جلی ہوں تنہا
میں نے آواز لگائی ہے اسیران قفس
یونہی لب بستہ رہو گے کب تک
مورچے باندھ لو صیاد سے ٹکرا جاؤ
میں تو آواز ہوں
آواز کا سودا نہ کرو

* رشتے *

کچے دھاگے جیسے
بندھن
اک جھٹکے میں ٹوٹ گئے
رشتے، ناطے
اپنے سارے
سب رستے میں چھوٹ گئے
وقت بُرا آیا تو
مجھ سے
سب کے سب منہ موڑ گئے
دیکھ کے اپنا خالی دامن
اشکوں کی برسات ہوئی
مجھ کو تو کچھ ہوش نہیں ہے
کب دن ڈوبا رات ہوئی
رشتوں کے جب دھاگے ٹوٹے
موتی موتی بکھر گیا
نازک تھا یہ رشتہ اپنا
اک جھٹکے میں ٹوٹ گیا

Shabana Ishrat
C/O. Late Abdul Rahman
Milan House, Near Shadi Mahal
Dargah Road, Patthar Ki Masjid
Patna-800006 (Bihar)
Mob: 7759882040

ڈاکٹر شمیم صادقہ

آؤ اب لوٹ چلیں

اتفاق سے مجھے کچھ دنوں کے لیے بڑے شہر جانا تھا۔ کچھ تقریب کا سلسلہ تھا اور اس کے بعد بھی میں کچھ دن اور رُک گئی۔ سامنے والے فلیٹ میں نیا شادی شدہ جوڑا رہتا تھا۔ ان کے بیچ غضب کی ہم آہنگی تھی۔ دونوں ساتھ باہر نکلتے۔ ساتھ ہی واپس آتے اور دیر رات تک قہقہے کی آواز آتی رہتی، جیسے یہ لوگ جنت کے مکین ہوں؛ کیونکہ ہر گھر میں تھوڑی تکرار اور کہا سنی ہونا تو عام بات تھی؛ مگر ان لوگوں کے یہاں صرف اور صرف خوشی تھی۔ مجھے یہ سب دیکھ کر عجیب سا لگا، جیسے کوئی کڑی مسنگ ہو۔ میں نے اپنی مامی سے پوچھا کہ ایسا کیا ہے ان کے بیچ؟ مگر مامی نے ہنس کر ٹال دیا اور ویسے بھی کسی کے پرسنل معاملے میں دخل دینے کا رواج بھی نہیں تھا۔

کچھ دنوں بعد میں لوٹ آئی اور میری زندگی بھی معمول پر آ گئی۔ وہی روز کے رُوٹین کے علاوہ تھا بھی کیا؟ کچھ دنوں بعد مامی سے بات ہوئی تو پوچھا، آپ کے پاس والے ہیپی کپل کا کیا حال ہے؟ تو مامی نے بتایا: دونوں اپنے اپنے راستے چلے گئے۔ یہ کیا بات ہوئی بھلا؟ کیا دونوں نے قانونی طور پر علاحدگی لے لی؟ مامی نے بتایا: ان کی شادی کب ہوئی تھی۔ وہ لوگ تو لیو اِن ریلیشن میں تھے اور اب ایسے رشتوں کو قانونی حق بھی مل گیا ہے۔

مجھے لگا جیسے یہ دیوداسی والا دور آ گیا ہے۔ کیا آج بھی عورت اتنی ہی سستی ہے، کیا آج بھی؟ جب کہ پڑھنے لکھنے میں، ملازمت کرنے میں، بچوں کی تربیت کرنے میں اور بوڑھے والدین کی خواہ وہ اپنے ہوں، یا شوہر کے کی خدمت کرنے میں خود کو کھپا دیتی ہے اور پھر آخر اس طور سے عورتیں اپنے کس خواب کی تعبیر گنوائیں، کیا ان کی عقل اور سیلف ریسپیکٹ ختم ہو چکی ہے؟

مجھے معلوم ہے کہ پہلے زمانہ میں گاؤں میں کسی کا رشتہ اگر طے ہوتا تھا تو مہینوں ڈھول بجتے تھے۔ یہ ڈھول ایک طرح کی منادی تھی کہ اگر گاؤں پر گاؤں میں کسی کو اس رشتے سے کوئی شکایت ہے، یا کوئی خبر کرنی ہے تو آ کر کہہ دے؛ تا کہ کسی کے ساتھ دھوکہ نہ ہو۔

پھر وقت کچھ بڑھا تو لڑکیوں کو دیکھنے کے لیے سبزی والیاں،

چوڑی والیاں بحال کی جانے لگیں، جو جا کر لڑکی کو دیکھیں، پرکھیں اور صحیح صحیح اطلاع دیں۔ اس اطلاع کو ایمانداری کی سند حاصل تھی۔ پھر بڑے بزرگ آپس میں بات طے کرتے۔ نہ کوئی لین دین کی بات ہوتی اور نہ دین مہر کا جھگڑا ہوتا اور نہ کوئی اور ایسی بات ہوتی۔ شادی کا مطلب تھا زندگی بھر کا رشتہ۔ نہ آج کی طرح لڑکیوں کو مار پیٹ کر جہیز لانے کے لیے مجبور کیا جاتا اور نہ کوئی جسمانی اذیت دی جاتی۔ نہ آج کی طرح لڑکیوں کا قتل کر کے پھینک دیا جاتا۔ نہ لڑکیوں کو اپنے شوہروں پر پہرہ بٹھانے کی ضرورت تھی کہ وہ محلے میں کسی لڑکی سے بات نہ کرے۔ نہ کسی کے گھر جاتے۔ یہ خلوص اور اعتماد کا مکمل رشتہ ہوتا تھا۔

"وہ بھی ایک عام لڑکا تھا۔پڑھنے میں اوسط۔صورت شکل میں بھی اوسط،مگر خواب دیکھنے میں نمبر ون۔گھر کے لوگوں نے خوب کلاس لی۔محلے والوں نے پٹائی بھی کردی،مگر وہ باز نہیں آیا۔گھر کے لوگوں نے ہار مان کر کہہ دیا کہ تم پڑھ لکھ کر کسی کام میں لگ جاؤ تو اُسی لڑکی سے شادی کریں گے،مگر یہ لڑکی والوں کے لیے عزت کا سوال تھا۔دوسرے شہر لے جاکر جلدی جلدی میں لڑکی کی شادی کردی اور انجام بخیر ہوا۔"

بدلتے وقت کے ساتھ بہت کچھ بدلتا گیا۔ مدرسے کی پڑھائی شروع ہوئی، مگر لیلیٰ مجنوں کا دور نہیں تھا کہ لیلیٰ کو مار پڑتی تو مجنوں کا ہاتھ زخمی ہو جاتا۔ پڑھنے کی ہر غلطی پر ماسٹر صاحب بڑی بے رحمی سے پٹائی کرتے۔ ایسا کہ پھر بچوں کو زندگی بھر کا سبق مل جاتا۔ وہ پھر کبھی غلطی نہیں کرتے۔ مدرسے کے بعد اسکول کی باری آئی، جہاں پر ہر طرح کے موضوع سامنے آنے لگے۔ بچوں کو محسوس ہونے لگا، جیسے وہ کھلے آسمان کے نیچے آ گئے؛ مگر جہاں وسعت وہیں سخت پابندیاں بھی لگیں۔ یہ مدرسے کی تعلیم اور تربیت کا اثر تھا؛ مگر کب تک کہ تیز آندھیوں میں تو بڑے بڑے خیمے اکھڑ جاتے ہیں اور یہ تو بچوں کے بڑھتے ہوئے ذہن کی کرشمہ سازیاں تھیں۔ دھیرے دھیرے لڑکے اور لڑکیوں کے بیچ فطری کشش بڑھنے لگی۔ وہ ہوسٹل کا دور نہیں تھا۔ گمنام خط لکھے جاتے اور پھر گمنام جواب آتے۔ ملنے کی جگہ مقرر ہوتی اور تب کیسی دوری۔ کبھی تو بے حد نفرت ہوتی تو کبھی اپنائیت۔ آہستہ آہستہ یہ اپنائیت رنگ لانے لگی تو گھر والوں کے کان کھڑے ہونے لگے۔ سب سے آسان تھا لڑکیوں کی پڑھائی بند کرا دینا اور لڑکوں کو اسکول بدل دینا۔ اُس زمانے میں آج کی طرح داخلے کا مسئلہ نہیں تھا۔ نہ کلاس کی ٹینشن تھی، لوگ بس محنت سے پڑھاتے اور چاہتے تھے کہ کسی طرح بھی پڑھ لے۔

مگر خواہشات پر کبھی بھی پابندی نہیں لگ سکی ہے۔ ملنے اور ملانے کا یہ سلسلہ رازداری سے چلتا رہا اور پھر آوارگی پنپنے لگی اور زندگی بے لگام ہوتی گئی۔ پھر وہ خوفناک انجام سامنے آیا کہ گارجین اور پاس پڑوس کے لوگ خبط ہو گئے۔

وہ بھی ایک عام لڑکا تھا۔ پڑھنے میں اوسط۔ صورت شکل میں بھی اوسط؛ مگر خواب دیکھنے میں نمبر ون۔ گھر کے لوگوں نے خوب کلاس لی۔ محلے والوں نے پٹائی بھی کردی، مگر وہ باز نہیں آیا۔ گھر کے لوگوں نے ہار مان کر کہہ دیا کہ تم پڑھ لکھ کر کسی کام میں لگ جاؤ تو اُسی لڑکی سے شادی کریں گے، مگر یہ لڑکی والوں کے لیے عزت کا سوال تھا۔ دوسرے شہر لے جا کر جلدی جلدی میں لڑکی کی شادی کردی اور انجام بخیر ہوا۔ یہ سب کچھ وقتی تھرل تھا۔ یہ کوئی ہیر اور رانجھے کا معاملہ نہیں تھا کہ لڑکی کچے گھڑے سے چناب پار کر لیتی۔ وہ اپنی شادی سے مطمئن تھی اور لڑکے کو بھی کوئی فرق نہیں پڑا۔ وہ پڑھنے لکھنے میں لگ گیا۔ گزرتے وقت کے ساتھ سارے ویلیوز دم توڑ چکے تھے۔ اب شادی کمائی کا ذریعہ بن چکی تھی اور مہنگے داموں کے لیے بہت محنت درکار تھی۔

پھر میں نے سنا وہ لڑکا کسی سرکاری دفتر میں کلرک ہو گیا اور اس کے لیے اونچی بولی لگنے لگی۔ لڑکیوں کی شادی پھر مسئلہ بن گئی۔ ایک عام سفید پوش گارجین کرے تو کیا کرے؟ ایک وقت کے فاقہ کے بعد وہ اتنے پیسے نہیں جمع کر پاتے کہ اس سودہ بازی میں سبقت لے جاتے۔ تھک ہار کر یہ فیصلہ لڑکیوں کے ہاتھوں میں دے دیا کہ وہ خود کوشش کرے۔ ہم لوگ شادی ارینج کروا دیں گے۔ مگر لڑکیوں کے پاس نہ تجربہ تھا اور نہ پرکھ کی صلاحیت۔ نتیجہ ہوا کہ کورٹ میرج کا لالچ دے کر لوٹی جانے لگی۔ کہیں ندی میں تیرتی ہوئی لاش ملتی اور کبھی ریل کی پٹریوں پر کٹی لٹی ملتیں۔ شاید کوئی لڑکی کامیاب بھی ہوتی تو سسرال والے قبول نہیں کرتے اور گھر سے نکال دیتے، جسے احتجاج کرنا تھا، وہ چپ رہ جاتا۔ کیونکہ یہ کوئی عشق نہیں تھا، بلکہ جنوں کے ہاتھوں کیا گیا ایک غلط فیصلہ تھا۔

ایک دفعہ ٹرین کے سفر میں میرے سامنے والے برتھ پر ایک لڑکی جسے بہت پیاس لگی تھی، میں نے بوتل آفر کی تو اس نے انکار کر دیا۔ شاید وہ کسی سے پانی لے کر پینا نہیں چاہتی تھی۔ تب ہی اگلے اسٹیشن پر ایک لڑکا پانی کی بوتل لے کر آیا۔ وہ شاید اس کا شوہر ہی ہوگا۔ اس نے فوراً پانی پی لیا۔ اس کے بعد وہ پیٹ درد سے لوٹنے لگی اور اُلٹیاں کرنے لگی۔ لوگوں نے چین کھینچ کر گاڑی رکوائی اور اسے ہاسپٹل لے جانے کا انتظام کیا۔ مجھے معلوم نہیں ہوسکا کہ وہ پہنچ سکا یا نہیں؛ کیونکہ اس بوتل میں ابارشن کی دوا ملی ہوئی تھی۔

اس بے سمت رفتار کا آخر خاتمہ کہاں ہوگا۔ ماں باپ رشتہ خریدنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ لڑکیاں بار بار دھوکہ کھاتی رہتی ہیں۔ لڑکے اونچی قیمت کے چکر میں کچھ نہیں دیکھتے۔ انھیں اپنا اسٹیٹس بڑھانا ہوتا تھا۔ کبھی اس بوجھ سے دب کر گارجین کی بے وقت موت ہوجاتی۔ کبھی وہ بھی رشوت خوری میں لگ جاتے۔ کبھی اپنی مٹھی بھر پشتینی زمین بیچ ڈالتے تو کبھی بیٹوں کا سودا وہاں کر دیتے، جہاں انھیں ادھیڑ عمر بدشکل عورت کو بہو کی شکل میں قبول کرنا پڑتا اور بیٹا ناراض ہوکر گھر سے چلا جاتا، جو خواب اس نے دیکھا تھا، وہ اس خواب سے کسی طرح بھی سمجھوتہ نہیں کر پاتا۔

زندگی گزرتی جاتی؛ مگر یہ ایک لاحاصل سفر تھا۔ اس کی کوئی منزل نہیں تھی، کیونکہ اس سفر کو ہم لوگوں نے چنا تھا۔

مجھے یاد ہے کہ ایک رشتہ کی بہت ہی امیر خالہ کے ساتھ میں بھی ایگزیبیشن گئی تھی۔ خالو انکم ٹیکس افسر تھے۔ اماں نے میری مٹھی میں ایک اٹھنی دبا دی تھی۔ اس وقت کی یہ اٹھنی آج کے کم از کم تین سو روپے تو تھے ہی۔ خالہ کی بیٹیاں فیشن کی بہت چیزیں خریدتی رہیں۔ مگر مجھے نہ تو فیشن کا علم تھا اور نہ جاننے کی خواہش۔ وہ گڑیوں سے کھیلنے کی عمر تھی اور میری نظر بار بار اُس خوبصورت گڑیا کے گرد گھوم رہی تھی۔ خالہ نے میری نظر کو دیکھا۔ میں نے چپ چاپ اٹھنی خالہ کو دے دیا۔ انھوں نے اٹھنی کو لیا اور ایک دوسری سستی والی گڑیا خرید کر مجھے دے دی۔ میں نے گھر آکر اماں کو بتایا۔ اماں نے ویسی ہی گڑیا منگوادی تھی؛ مگر وہ گڑیا اور اس سے زیادہ خالہ کا رویہ میرے اندر تراز و ہوگیا۔ اب تو خالہ اور خالو دونوں فوت ہوچکے ہیں اور اُن کا پشتینی مکان ویران پڑا ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے سارے ویلوز ختم ہوگئے۔ میں اپنے گھر میں تو خوش تھی؛ مگر میرے چاروں طرف ویرانی ہی تھی۔ کیسی گھر کی ویرانی اور بچوں کے نہ ہونے کا درد تو کبھی کاغذ کے پھٹے پھٹے ٹکڑوں جیسی زندگی، جس میں نہ خوشی تھی، نہ ذہنی آہنگی تو کبھی ادھیڑ عمر کے بعد کا دھوکہ۔ غلط شادی کا فیصلہ اور اس فیصلے کا بھگتان نسلوں تک کی کھیتی اجڑ جاتی ہے، جیسے کوئی انسان پہلے ٹڈی دل کو دیکھ کر دم بخود رہ جاتا ہوگا۔

> ”مجھے پہلی بار کا وہ ہوائی سفر یاد ہے، جب میں نے پلین کی کھڑکی سے دیکھا تو مجھے اچانک افسوس ہوا کہ نیچے چلنے والی کاریں اور رکشے کس قدر خوش اور مطمئن ہیں ۔یہ کیا کہ چند گھنٹوں میں کہاں سے کہاں پہنچ گئے ۔نہ سفر کا مزہ اور نہ کوئی خوبی۔تب مجھے احساس ہوا کہ یہ لیوان ریلیشن والا رشتہ کس قدر ناقص ہے۔لوگ ساتھ ہی رہے اور نہیں بھی رہے۔اپنے آپ تو خالی ہی رہ گیا۔کیا دیا اور کیا لیا۔تب مجھے لگا کہ وہ برسوں پرانا رواج ڈھول بجا بجا کر رشتوں کی منادی کرنا اور شادی کرنا کتنا محفوظ قدم تھا۔“

مجھے پہلی بار کا وہ ہوائی سفر یاد ہے، جب میں نے پلین کی کھڑکی سے دیکھا تو مجھے اچانک افسوس ہوا کہ نیچے چلنے والی کاریں اور رکشے کس قدر خوش اور مطمئن ہیں ۔ یہ کیا کہ چند گھنٹوں میں کہاں سے کہاں پہنچ گئے ۔ نہ سفر کا مزہ اور نہ کوئی خوبی۔ تب مجھے احساس ہوا کہ یہ لیوان ریلیشن والا رشتہ کس قدر ناقص ہے۔ لوگ ساتھ ہی رہے اور نہیں بھی رہے۔ اپنے آپ تو خالی ہی رہ گیا۔ کیا دیا اور کیا لیا۔ تب مجھے لگا کہ وہ برسوں پرانا رواج ڈھول بجا بجا کر رشتوں کی منادی کرنا اور شادی کرنا کتنا محفوظ قدم تھا۔

آؤ اب لوٹ چلیں۔

□□□

Shameem Sadqua
105 Rahman Plaza
Federal Colony
Phulwari Sharif
Patna-801505 (Bihar)

ڈاکٹر نغمہ جاوید ملک

درد آشنا

جمال الدین بیٹھک میں بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے کہ دادی رضوانہ اور سلیمان کو ساتھ لیے حویلی میں داخل ہوئیں رضوانہ بالکل سادے کپڑوں میں تھی دادی بیٹھک میں داخل ہوئیں تو ساتھ میں سلیمان بھی تھا جمال الدین نے سوالیہ نگاہوں سے سلیمان کو دیکھا سنجیدہ، بردبار اور خوبرو سے اس لڑکے نے انھیں جھک کر سلام کیا دادی جلدی سے بولیں .... یہ میری سہیلی کا بیٹا سلیمان ہے ایران سے آیا ہے۔

ایران کا نام سن کر جمال الدین نے دلچسپی سے اسے دیکھا

''برخردار کیا کرتے ہو؟''

''جی! ابھی پڑھ رہا ہوں''سلیمان نے جواب دیا

جمال الدین اور وہ دیر تک باتیں کرتے رہے اس لڑکے کا بول چال کا سلجھا ہوا انداز، ذہانت، سادگی اور انکساری نے انھیں بہت متاثر کیا۔

کئی روز گزر گئے سلیمان کا زیادہ تر وقت بیٹھک میں ہی گزرتا اور کردار اور گفتار سے اس نے جمال الدین کے دل میں اپنی جگہ بنالی تھی یہ لڑکا انھیں بھا گیا تھا ایک دن انھوں نے ماں کے پاس بیٹھ کر بڑے رازدانہ انداز میں کہا۔

''اماں جان بہت دنوں سے ہم اپنی بیٹی کے لیے مناسب رشتے کی تلاش میں ہیں سلیمان ہماری نگاہوں میں جچ گیا ہے ہمیں ایسا لگتا ہے خدا نے ہماری دعا سن لی ہے ہماری مراد پوری کردی ہے جیسا لڑکا چاہتے تھے وہ تمام خوبیاں ہمیں سلیمان میں نظر آتی ہیں کیوں نہ ہم اپنی بیٹی کا رشتہ سلیمان سے طے کردیں۔''

''ایسی کیا خوبی نظر آئی تمھیں اس لڑکے میں کہ بنا جانچ پڑتال کیے فدا ہو گئے؟

مجھے تو کوئی خاص بات نظر نہیں آتی۔''

''اماں ہم نے دنیا دیکھی ہے اس کے اخلاق اور سادگی نے ہمارا دل جیت لیا ہے''

''پتہ نہیں کون سے سرخاب کے پر لگے ہیں اس میں جو لٹو ہوئے جا رہے ہو، مجھے تو نظر نہیں آتے؟''

دادی نے لاپرواہی سے برا سامنہ بنا کر کہا

''اماں جان! آپ کو وہ اچھا نہیں لگا، ہمیں تعجب ہو رہا ہے؟''

''اپنی اپنی پسند ہے۔'' دادی نے کہا تو جمال الدین کا پارہ چڑھ گیا

''اچھا یہ بتائیں، ناپسندگی کی وجہ کیا ہے؟'' ان کی تیوریوں پر بل پڑ گئے تھے۔

''وہ چھوٹی ذات کا ہے'' دادی نے کہا

تو وہ بے اختیار کہہ اٹھے------'' اتاں! لیکن واللہ ہمیں اس میں وہ ساری خوبیاں نظر آ رہی ہیں جو ہم اپنے داماد میں دیکھنا چاہتے ہیں کس ذات کا ہے۔

''مواجولاہا ہے'' دادی نے برا سا منہ بنایا، جیسے منہ میں کرواہٹ گھل گئی ہو۔

''پر وہ تو کہیں سے بھی چھوٹی ذات کا نظر نہیں آتا! ان کی آنکھوں میں حیرانی تھی۔

''کیا مطلب؟ کیا چھوٹی ذات والوں کے سینگ اگے ہوتے ہیں؟'' دادی نے اپنی مسکراہٹ کو بڑی مشکل سے چھپاتے ہوئے کہا۔

''آپ مذاق تو نہیں کر رہیں''

''میں بھلا کیوں مذاق کرنے لگی ذات سن کر تو تمھارا ارادہ بدل جائے گا.....''

''اب تک ہمیں کوئی لڑکا پسند ہی نہیں آیا تھا۔لیکن اسے دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ ذات پات کوئی اہمیت نہیں رکھتی ہمارے دل میں ایک غلط خیال پیدا ہو گیا تھا اور اتاں جان آپ ہی تو کہتی ہیں کہ اسلام میں ذات پات کا کوئی تصور ہے ہی نہیں''

''صبح کا بھولا شام کو گھر آ جائے تو اسے بھولا نہیں کہتے'' دادی جان کھل کھلا کر ہنس پڑیں تھیں۔

''اماں جان آپ تو پہیلیاں بجھا رہی ہیں'' ان کے چہرے پر الجھن تھی۔

''تو بسم اللہ کر کے انگوٹھی اس کی انگلی میں پہنا دو میں اسے بلا کر لاتی ہوں نیک کام میں دیر نہیں کرنی چاہیے'' دادی نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا

''انگوٹھی تو تیار نہیں ہے ابھی'' وہ بولے۔

''میں نے تیار کر کے رکھی ہوئی ہے لاتی ہوں'' دادی کا چہرہ کھلا ہوا تھا

انھوں نے سلیمان کو ساتھ لیا اور بیٹھک میں چلی آئیں اور ایک بہت نفیس سی چاندی کی ڈبیا جمال الدین کے ہاتھ میں تھما دی۔

''بیٹے سلیمان! ہم چاہتے ہیں کہ اپنی بیٹی رضوانہ کا رشتہ آپ کے ساتھ طے کر دیں۔

آپ نے ہماری بیٹی رضوانہ کو تو دیکھا ہے کیا آپ اسے اپنا ہم سفر زندگی بنانا پسند کریں گے؟'' جمال الدین نے بڑی بیتابی سے کہا دادی کو بیٹے کی اس ادا پر ہنسی آ گئی۔

''لیکن میری تو شادی ہو چکی ہے، معافی چاہتا ہوں'' سلیمان نے سنجیدگی سے کہا۔

''کیا کہا تمھاری شادی ہو چکی ہے؟'' اچانک وہ بڑے افسردہ اور تھکے تھکے سے نظر آنے لگے تھے۔جیسے کسی نے ان کی قیمتی چیز چھین لی ہو۔

ان کا سارا جوش ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔

''معاف کرنا بیٹے انجانے میں ہی ہم یہ سب کہہ بیٹھے جمال الدین نے مری ہوئی آواز میں کہا۔

''اس میں آپ کی کوئی غلطی نہیں ہے سلیمان نے بڑی متانت اور سنجیدگی سے کہا۔

اب تک دادی خاموش بیٹھی سارا تماشہ دیکھ رہی تھیں بیٹے کو اتنا افسردہ اور نڈھال دیکھ کر وہ ضبط نہ کر سکیں۔

''سلیمان اپنے سسر کے ہاتھ سے انگوٹھی پہن لو''

''کیا کہا آپ نے اتاں جان؟ سسر؟ شادی والی بات غلط تھی کیا؟ ہمارے کان تو نہیں بج رہے ہیں'' وہ اچھل پڑے تھے۔

''صاحب زادے! تم نے جو سنا ٹھیک ہی سنا پہنا دو انگوٹھی کان وان نہیں بج رہے ہیں تمھارے! دادی زور سے ہنس پڑیں۔

انھوں نے ڈبیہ کھول کر ایک پیاری سی ہیرے کی انگوٹھی سلیمان کی انگلی میں پہنا دی۔

''مبارک ہو آج ہم بہت خوش ہیں ارے ہماری بیگم کو تو بلایئے، اور چھوٹوں سے کہیں کہ دوڑ کر مٹھائی لے آئے ارے ایک بات تو ہم بھول ہی گئے، رضوانہ کو تو کوئی اعتراض نہیں ہوگا''

''بیٹا! یہ رضوانہ کی ہی پسند ہے'' دادی نے بھولی سی صورت بنا کر کہا

''تب تو ہم کوئی زیادتی نہیں کر رہے ہیں اپنی پسند اس پر نہیں تھوپ رہے ہیں'' نا بیٹا نا! یہ تو رضوانہ کی ہی پسند ہے جس پر تم نے مہر لگا دی ''دادی نے چھیڑا۔

جمال الدین کے کان کھڑے ہوئے---'' کیا مطلب؟''

''مطلب یہ وہی سلیمان ہے، اس کا کلاس فیلو جسے اس نے پسند کیا تھا اور تم کسی طرح اس رشتے پر آمادہ نہیں ہوئے تھے چھوٹی ذات کا کہہ کر تم نے اس سے ملنا بھی پسند نہیں کیا تھا۔'' دادی کا پورا چہرہ مسکرا رہا تھا۔

اماں جان آپ نے ہماری بچی کی زندگی کو برباد ہونے سے بچا لیا ہماری ضد اسے جہنم میں دھکیل دیتی زندگی بھر وہ روتی رہتی اور ہمیں کوستی رہتی ہم آپ کے تہہ دل سے ممنون ہیں ہم انجانے میں اپنی بیٹی کے ساتھ کتنی بڑی ناانصافی کر رہے تھے۔

سلیمان ''معاف کرنا بیٹے سلیمان، ہم سے بڑی بھول ہوئی آخر ہے کس کی بیٹی، ہماری بیٹی کا انتخاب بھلا غلط کیسے ہو سکتا ہے؟ ہمیں ناز ہے اس کی پسند پر...... جمال الدین نے ہنستے ہوئے کہا

دادی جان کو ذرا بھی امید نہیں تھی کہ سب کچھ اتنی آسانی سے ہو جائے گا۔

'' آخر بیٹا کس کا ہے؟ مجھے امید تھی جس دن اسے اپنی غلطی کا احساس ہوگا، فوراً مان لے گا'' دادی بھی پیچھے رہنے والی کہاں تھیں۔

''بس اب ریسپشن کا انتظام کرو'' دادی نے بیٹے سے کہا تو انھوں نے حیران ہو کر ماں کو دیکھا۔

'' جتنا میں نے کہا بس اتنا ہی کافی ہے مجھے اپنے ضدی بیٹے پر پوری طرح بھروسہ نہیں تھا اس لیے میں نے دونوں کو شادی کے بندھن میں پہلے ہی باندھ دیا تھا تاکہ اگر تم گڑبڑ کرو تو میں دو زندگیوں کو تمھاری قید سے رہائی دلا کر جینے کا موقع دے سکوں مجھے اپنے بیٹے پر فخر ہے کہ اس نے ہیرے اور پتھر میں فرق کرنا سیکھ لیا شاباش بیٹے!''

جمال الدین قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔''اماں جان ہمیں آپ پر ناز ہے کہ ہمیں اتنی بہادر اور ہمت والی ماں ملی ہے''

''بس اب زیادہ باتیں نہ بناؤ، تیاری شروع کرو اور ہاں! خیال رہے، فضول خرچی مت کرنا۔ مناسب طور پر انتظام کرنا سب سے پہلے غریبوں میں مٹھائی تقسیم کرادو''

کالج میں اپنے کلاس فیلو سلیمان سے رضوانہ کی دوستی ہوگئی تھی سلیمان تھا تو جولاہا لیکن اخلاق اعلیٰ درجے کا تھا جولاہا ہونے کے باوجود رہن سہن کے معیار میں کوئی کسر نہیں تھی۔

اور ایک وقت ایسا بھی آیا کہ دوستی دھیرے دھیرے گہری محبت میں بدل گئی۔ دونوں ایک دوسرے کے بغیر جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے ادھر باپ اعلیٰ خاندان کا لڑکا اپنی نازو پالی بیٹی کے لیے ڈھونڈ رہے تھے ایک دن رضوانہ نے ماں سے صاف کہہ دیا کہ وہ اپنا جیون ساتھی چن چکی ہے جب ماں کو معلوم ہوا تو ان کے پیروں تلے سے زمین سرک گئی اپنے شوہر کو وہ جانتی تھیں، خاندان کی اہمیت ان کے لیے ہر چیز سے بڑھ کر تھی وہ کبھی یہ گوارہ نہیں کریں گے کہ اپنی اکلوتی بیٹی کا رشتہ ایک چھوٹی ذات کے لڑکے سے کر دیں ان کا داماد جولاہا ہو---- یہ تو وہ خواب میں بھی نہیں سوچ سکتے تھے ماں نے رضوانہ کو ہر چند سمجھانے کی کوشش کی لیکن اس نے صاف کہہ دیا کہ شادی کرے گی تو صرف اور صرف سلیمان سے---ماں نے دودھ کا واسطہ دیا ہر اونچ نیچ سے آگاہ کیا بیٹی کا ایک ہی جواب تھا کہ میں سلیمان کو چھوڑ کر کسی اور سے شادی کر لوں، یہ آپ نے سوچ بھی کیسے لیا؟۔سلیمان چھوٹے خاندان کا ضرور ہے لیکن ایک اچھے انسان میں جو خوبیاں ہونی چاہیے وہ سب اس میں موجود ہیں میں خاندان کو نہیں انسان کو اہمیت دیتی ہو ہم دونوں ایک دوسرے سے دور رہ کر زندگی جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتے ماں نے ڈرتے ڈرتے باپ سے کہا تو پٹھانی خون کھول اٹھا کیا اسی دن کے لیے بیٹی کو نازنخروں سے پالا تھا کہ بڑے ہو کر خاندان کی آبرو کو مٹی میں ملا دے بیٹی کو سمجھاؤ، اگر اس نے من مانی کی تو اس گھر میں اس کے لیے کوئی جگہ نہیں ہم اپنے دل پر پتھر رکھ لیں گے، سمجھ لیں گے کہ ہماری لاڈلی اللہ کو پیاری ہوگئی ماں نے بہت منت سماجت کی سمجھایا کہ محبت اندھی ہوتی ہے باپ کا ایک ہی جواب تھا۔

'' یہ رسوائی ہم برداشت نہیں کر سکتے لوگ ہنسیں گے کہ باپ ایک بیٹی کو بھی نہیں سنبھال سکے رضوانہ کی ماں تمھارے سامنے اس محلے کی کتنی لڑکیاں بیاہ کر گئی ہیں ہم نے اپنی بیٹی کو پڑھایا تھا تاکہ وہ لکھ پڑھ کر باپ کا نام روشن کرے اگر ہمیں پتہ ہوتا کہ یہ لڑکی تعلیم حاصل کر کے باپ کی ناک کٹوائے گی تو کالج کا منہ ہی نہیں دیکھنے دیتے۔ماں نے صوفیہ کی یاد دلائی جو جمال الدین کی بہن کی بیٹی تھی اس نے اپنی پسند کے لڑکے سے شادی کی تھی۔

''بیگم! لڑکا اپنے ہی خاندان کا تھا، ایرا غیرا نتھو خیرا سے اس نے عشق نہیں لڑایا تھا ہماری لڑکی بھی اپنے خاندان کی کسی لڑکے کو پسند کر لیتی تو واللہ ہم اپنی بیٹی کی پسند کا احترام کرتے لیکن جانتے بوجھتے ہم مکھی نگل لیں یہ ہم سے نہیں ہو سکتا۔

ماں نے اپنے بیٹے کو لاکھ سمجھایا''بیٹا! اللہ کی نگاہ میں کوئی چھوٹا بڑا نہیں اپنی بیٹی کی ناسمجھی کو معاف کر دیں دوسروں کی پرواہ نہ کریں دو چار روز بولیں گے پھر بھول بھال جائیں گے اگر ہم نے اپنی رضوانہ کی شادی زبردستی اپنی پسند کے لڑکے سے کر دی تو اس کی زندگی تباہ و برباد ہو جائے گی اب جو غلطی ہوگئی سو ہوگئی۔بیٹی کو معاف کر دیں۔

رضوانہ کی ماں بھی بہت روئی پیٹیں، کھانا پینا چھوڑ دیا پر جمال الدین کا دل نہیں پسیجا انھوں نے امینہ بانو سے صاف کہہ دیا کہ اگر بیٹی اتنی بھی عزیز ہے تو جاؤ تم بھی مجھے چھوڑ کر چلی جاؤ شوہر کو چھوڑ کر چلی جائیں یہ تو وہ خواب میں بھی نہیں سوچ سکتی تھیں۔شوہر مجازی خدا کہلاتا ہے یوں بھی

میاں کو ان سے عشق تھا وہ جو کہا جاتا ہے کہ ایسا مرد چلتی کے قدم اور سوتی کی سانس گنیں، نصیب والی کو ملتا ہے واقعی وہ نصیب والی تھیں بیاہ کر آئیں تو پندرہ سال کی تھیں تھی بھی بلا کی حسین رنگت ایسی اجلی اور گلابی گلابی لگتا کسی نے میدے میں گلاب کی پتیاں ملا دی ہیں جمال الدین تو سو جان سے فدا.....ان کا تو بس نہیں چلتا تھا کہ دن رات انھیں بیٹھ کر دیکھا کریں..... پر گھر کے رسموں رواج ایسے کہ ماں باپ کے سامنے بیوی سے بات کرنا تو دور اس کی طرف دیکھنا بھی بے ادبی سمجھی جاتی یوں بھی سسر کے سامنے ہاتھ بھر لمبا گھونگھٹ چہرے کو چھپائے ہوتا۔

قسمت کا کرنا ایسا ہوا کہ شادی کو دس برس گزر گئے، لیکن گود ہری نہ ہوئی ددیا ساس نے ہر چند کہا سنا، اللہ کا واسطہ دیا کہ پوتا دوسری شادی کر لے گھر کا چراغ نہ روشن ہوا تو خاندان کا نام ونشان مٹ جائے گا۔کوئی نام لیوا تو پیدا ہو جائے لیکن جمال الدین جانے کس مٹی کے بنے تھے دادی کی ہار پکار کا ان پر کوئی اثر نہ ہوا انھوں نے صاف کہہ دیا۔

دادی جان !اگر آپ کے نصیب میں میرے بچے کا منھ دیکھنا لکھا ہے تو آپ کی آپ کی پوت بہو امینہ بانو کی ہی گود اللہ تعالیٰ ضرور بھر دیں گے دوسری شادی کرنے سے تو میں رہا ماں نے تعویز گنڈے کرائے لیکن سب بے اثر.....امینہ بانو نے بھی اپنے دل پر پتھر رکھ کر ساس کی خواہش پوری کرنے کے لیے میاں کو سمجھایا کہ دوسری شادی کر لیں۔

''میرے سامنے حماقت کی باتیں مت کرو اللہ نے اگر میری قسمت میں بے اولاد ہونا لکھا ہے تو میں اس کی رضا میں راضی ہوں۔اپنی محبوب بیوی کی چھاتی پر سوتن لا کر بیٹھا دوں یہ مجھ سے نہیں ہوگا''

امینہ بانو نے سر سجدے میں رکھ کر اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا کہ اس نے انھیں ایسا نیک دل شوہر عطا کیا ہے اسی سال سسر تو بچے کی کلکاری سننے کی تمنا لیے اللہ کو پیارے ہو گئے۔ساس کی عدت پوری ہونے کے بعد امینہ بانو نے میاں سے کہا۔

''اماں جان اور ددیا ساس کو لے کر حج کو چلیں وہاں پہنچ کر ان کے دل کو بھی سکون میسر آئے گا اور میں بھی کعبہ شریف کا پردہ پکڑ کر گڑگڑا کر پاک پروردگار سے دعا کروں گی کہ میری ساس کی تمنا پوری ہو جائے ان کی گود میں ہماری اولاد کھیلے۔''

حج کو تو وہ کئی بار جا چکے تھے، اپنے والدین کو لے کر لیکن آمنہ بانو کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے انھوں نے فوراً حامی بھر لی اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ حج سے واپس آئے تین مہینے بھی نہیں ہوئے تھے کہ امینہ بانو کا پیر بھاری ہو گیا ساس کو معلوم ہوا تو ہزاروں روپے غریبوں میں تقسیم کرائے۔ بہو کا اتنا خیال کہ ہمہ وقت ایک نوکرانی ساتھ رہتی تھی ہر وقت دلہن کو ہدایتیں دیتیں کہ یہ کرو وہ نہ کرو-–ایسے اٹھو، ایسے چلو، ایسے بیٹھو۔

امینہ بانو اور جمال الدین کی خوشی کا تو ٹھکانا ہی نہیں تھا اللہ کے حضور میں دعا کرتے کہ جینے جاگنے کے لیے اولاد دے بیٹا ہو یا بیٹی اس کے بارے میں انھوں نے کبھی سوچا ہی نہ تھا۔

اللہ اللہ کر کے وہ دن آ ہی گیا جب امینہ بانو نے ایک چاندسی بیٹی کو جنم دیا دور قریب کے سارے رشتے دار ایک ہفتے تک ان کے یہاں رہے دودوباورچیوں نے مزیدار کھانے بنائے۔

مٹھائی بھی دل کھول کر ہندو مسلمانوں میں تقسیم کی گئی بڑے ناز نخروں سے رضوانہ کی پرورش ہوئی باپ کی تمنا تھی کہ بیٹی کو اعلی تعلیم دلائیں۔

وقت گزرتا رہا رضوانہ دادی کی چہیتی ، ماں کی لاڈلی اور باپ کی آنکھوں کا تارا تھی۔رضوانہ کی دادی اپنے بیٹے کو کیسے بتاتیں کہ نوعمری میں وہ بھی صابر سے الفت کر بیٹھی تھیں۔

اس زمانے میں گھر کی چھتیں سٹی ہوئی ہوتی تھیں صابر کی عمر انیس سال کی رہی ہوگی، گرمی کی شاموں میں وہ کتابیں لے کر پڑھنے کے لیے آتا تھا کبھی کبھی پتنگ بھی اڑاتا تھا۔وہ لوہار کا بیٹا تھا بازار میں ان کی بڑی دکان تھی پتا نہیں کب اور کیسے دو دل ایک ساتھ دھڑکنے لگے۔صابر کو پڑھتے دیکھ کر شمیمہ کا دل چاہتا کہ وہ بھی کالج جائے لیکن ان کے گھرانے میں لڑکیوں کو پڑھائی کے لیے گھر سے باہر بھیجنا معیوب سمجھا جاتا تھا اس زمانے میں سبھی اردو فارسی کی تعلیم ضرور حاصل کرتے تھے اتفاق ایسا ہوا کہ استاد وحید الدین اپنے بڑے بیٹے کے پاس اٹاری چلے گئے۔اجمل خاں نے اپنے دوست ڈاکٹر کیلاش سے کہا کہ کسی اچھے استاد کا نام بتائیں تاکہ لڑکی پڑھنا لکھنا نہ بھول جائے انھوں نے کہا " فکر کیوں کرتے ہیں اپنا صابر پڑھا دیا کرے گا''لوہار کا بیٹا؟'' اجمل خاں نے کہا۔

''ہاں وہی بڑا قابل اور ہوشیار ہے میری بیٹی کو بھی وہی پڑھاتا ہے''

جتنی دیر صابر شمیمہ کو پڑھاتا، دادی جان کمرے میں ہی موجود تسبیح پڑھتی رہتیں اور ان کو خبر بھی نہیں ہوئی کہ دو دل روز بروز ایک مضبوط ان دیکھی ڈور کے بندھن میں بندھتے جا رہے ہیں-بنا لکھے ان کے بیچ ایک پوری کتاب لکھی جا رہی ہے چاہت کی یہ داستان بڑی عجیب تھی نہ صابر نے اپنے جذبوں کو الفاظ کی بندشوں میں قید کیا-نہ شمیمہ کی خاموشی کو زبان ملی ایک لمحے کے لیے دونوں کی نگاہیں ملتی اور جھک جاتیں دل میں ہزاروں چراغ ایک ساتھ جل اٹھتے اور دونوں پیار کی انوکھی لذت سے شرابور ہو جاتے۔

عندلیب صاحب کی شاعری کی ایک خصوصیت معاملہ بندی بھی ہے۔

تصویر میں نے مانگی تھی شوخی تو دیکھئے
ایک پھول اس نے بھیج دیا ہے گلاب کا

عندلیب صاحب کی شاعری میں مکالماتی انداز بھی دیکھنے کو ملتا ہے جو مخاطب کو دلکش انداز میں اپنی طرف متوجہ کرتا ہے:

لو جاؤ کہہ کہ پھر دامن نہ چھوڑنا
کہنا پھر آہ بھر کے مگر بھولنا نہیں

اللہ بولتے نہیں تو مسکرا ہی دو
میں کب سے منتظر ہوں تمھارے جواب کا

ان کی شاعری میں تحیر اور تعجب بھی نظر آتا ہے

اللہ وہ قربت کے لمحے دل کا یہ عالم تھا جیسے
پھولوں کی جوانی میری ہے تاروں کا تبسم میرا ہے

عندلیب صاحب کی شاعری میں صاف ستھرا اور سنبھلا ہوا انداز پایا جاتا ہے جسے وہ بڑی پاکیزگی کے ساتھ بیان کرتے تھے۔ ان کی شاعری میں سلاست و سادگی پائی جاتی ہے۔ انھوں نے صاف شائستہ اور رواں زبان استعمال کی ہے۔ ان کا یہی انداز ان کے کلام میں حسن و دلکشی پیدا کر دیتا ہے:

چاندنی اور اداس تنہائی
تم ہو کس حال میں خدا جانے

شادانی صاحب کے یہاں محبوب سے بے نیازی اور بے وفائی کا جو گلہ ملتا ہے وہ حقیقتاً نہیں ہے بلکہ وہ عشق و محبت کے جذبات پر مبنی ہے۔ محبوب سے شکوہ کرتے وقت ان کا لہجہ نرم و ملائم ہوتا ہے۔

کیا کروں آہ بھلایا نہیں جاتا مجھ سے
وہی پیمان محبت جو تمھیں یاد نہیں

شادانی صاحب نے اپنی شاعری میں نہایت شریں و لطیف الفاظ استعمال کیے ہیں۔ وہ مبہم الفاظ کے استعمال سے گریز کرتے تھے۔ انھوں نے اپنی شاعری میں تراکیب کا بھی بڑا برجستہ استعمال کیا ہے۔ انھوں نے نئی نئی اور لطیف تراکیب سے اپنی شاعری کو دلکش انداز میں مزین کیا ہے۔ شادانی صاحب نے اپنی شاعری میں بلاشبہ تشبیہ، استعارہ، کنایہ، حسن تعلیل اور صنائع بدائع وغیرہ کا بھی استعمال کیا ہے۔

آغا شیدا کاشمیری لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر شادانی عاشقانہ شاعری کے دلدادہ ہیں یہ رائے ''نشاط رفتہ'' کے مطالعہ کے بعد میں نے قائم کی ہے اور یہ کوئی بری بات بھی نہیں ہے میرے خیال میں وہ شاعر ہی نہیں جو عاشق نہیں''

پروفیسر نظیر صدیقی کیں نزدیک

''شادانی کی تصانیف میں ''نشاط رفتہ'' گل سر سید کی حیثیت رکھتی ہے''

حواشی

1۔ نشاط رفتہ، ڈاکٹر عندلیب شادانی، تعارف سن 1951
2۔ تذکرہ شعراء اتر پردیش، حصہ دوم۔ صفحہ 242، اشاعت اول 1982، نظامی پریس لاہور
3۔ آزادی سے قبل اردو تحقیق، ڈاکٹر محمد اکمل، صفحہ ۱۵۵۔ مطبع ایچ ایس پرنٹرز دہلی۔ ایڈیشن 2013
4۔ میری زمین کے چاند ستارے، تذکرہ شعراء سنبھل (جلد اول) ڈاکٹر کشور جہاں زیدی، صفحہ 15، 16، سن اشاعت 2016، حامدی پرنٹ پوائنٹ دہلی 25۔
5۔ ''نصرت'' ہفت روزہ صفحہ 16۔ سن اشاعت 30 ستمبر 1916 لاہور
6۔ ڈاکٹر عندلیب شادانی شخصیت و فن، اشتیاق احمد، صفحہ 94، 2004۔ پنجاب یونیورسٹی لاہور
7۔ میزان شعر، شیدا کاشمیری، ص 303، دسمبر 1956 لاہور
8۔ مکاتیب وحشت بنام ڈاکٹر عندلیب شادانی (وحشت نمبر) ص 101 ستمبر 1952 کراچی
9۔ بیاض سخن، عندلیب شادانی، غیر مطبوعہ
10۔ ڈاکٹر عندلیب شادانی حیات و کارنامے، ڈاکٹر کلثوم ابو البشر، ص 156، 1992
11۔ ڈاکٹر عندلیب شادانی ایک مطالعہ، نظیر صدیقی، ص 53

□□□

Teemar Das Sarai
Near Junior High School
Urdu Ghar
Sambhal-244302 (U.P)
Mob: 9759817231

محمودہ قریشی

فیس بک سے واٹس ایپ تک

''مس فیس بک کہاں جا رہی ہو۔؟
جائیں گی کہا میڈم اپنی فیس بک وال کے لیے کوئی پوسٹ تیار کرنے لائبریری جا رہی ہوگی۔''

مبصرہ نے میری ٹانگ کھینچتے ہوئے کہا۔

''یار ایک بات بتا۔ تم اتنا وقت ان پوسٹ کو تیار کرنے میں محنت کرتی ہو کیا اتنے وقت میں تم اپنے نوٹس نہیں تیار کر سکتی ہو؟ پھر امتحانات میں تمھیں سب کی جی حضوری نہیں کرنی ہوگی۔''

بس بس دیوی جی۔ اگر آپ کے یہ خوبصورت تاثرات ختم ہو گئے ہوں تو کیا چلیں کلاس کا وقت ہو گیا ہے؟ نیلم میم کی پھٹکار یاد ہے نا ان کی گول عینک سے گول گول آنکھیں باہر ہی نکل آئیں گی۔

میری بات سنتے ہی مبصرہ جلدی سے کھڑی ہو گئی اور ہم چاروں طرف پھیلی مخملی ہریالی سے لطف اندوز ہوتے ہوئے، کچھ پھولوں کو توڑتے ہوئے لائبریری کی طرف سے نیلم میم کی کلاس کی طرف جانے لگے۔

میں نے لائبریری کے گیٹ پر ہی رک کر کہا۔

''تم لوگ نیلم میم کی کلاس لو میں چلی لائبریری کے اندر۔ ورنہ مجھے دیکھتے ہی ان کا پارہ پھر سے ہائی ہو جائے گا۔''

مبصرہ نے مجھ سے کلاس میں چلنے کا اصرار بھی کیا اور پھر اس نے مجھ سے ہاتھ چھڑاتے ہوئے کہا۔

''تم نہیں بدلنے والی، یہ کہانیاں، غزلیں پڑھ کر تمھیں کہانیوں والا راج کمار نہیں ملنے والا''

ملے گا یہی اس دنیا کا ایک انسان اور ہاں تم لائبریری جب جا ہی رہی ہو تو میرے لیے ہسٹری کی بک بھی تلاش کر لینا، ویدیک کالین، ہسٹری پر مجھے نوٹس تیار کرنے ہیں۔ میں اپنے لائبریری کارڈ پر پہلے ہی دو کتابیں لے چکی ہوں، پلیز تم اپنے کارڈ پر اس کتاب کو ایشو کرا لینا؟۔

''اوووں۔۔۔اووں میڈم یہ لو کارڈ اور خود سے ڈھونڈو اور پوری لائبریری اشو کراوں''۔ میں نے اسے اپنا لائبریری کارڈ ہاتھ میں پکڑاتے ہوئے کہا۔

''سچ تم نہیں بدلوگی مِس فیس بک۔''

مبصرہ مجھ سے کہتی ہوئی نیلم میم کی کلاس کی طرف بڑھ گئی۔ مجھے کلاس لینا بالکل بھی پسند نہیں ہے۔ گھر پر کافی اختلافات رہتے تھے اس سبب روز کالج آنا پڑتا تھا۔ جہاں میری حرکتوں سے ٹیچرس بھی ناراضگی کا اظہار کرتی ہیں۔ جس وجہ سے میں کلاس لینا پسند نہیں کرتی۔ اس لیے زیادہ تر وقت میں لائبریری میں ہی گزارتی ہوں۔ سیدھے لائبریری کا رخ کیا اور اردو شاعری کا ایک مجموعہ نکال کر ورق گردانی کرنے لگی ایک بہت ہی اچھا شعر نظر آیا، جس نے مجھے بہت متاثر کیا۔ خیال آیا کیوں نہ اس کو ایف۔ بی۔ پوسٹ کے لیے ذہن میں محفوظ کر لیا جائے۔؟ جو بھی اچھے جملے یا شعر نظر سے گزرتے میں فوراً انھیں ذہن کے ایک گوشے میں محفوظ کر لیتی اور رات کو اپنی ایف۔ بی وال پر لگا دیتی تھی۔ میری پوسٹ کا میرے فرینڈز کو بے صبری سے انتظار رہتا تھا۔ شیئر کرتے ہی کمینٹ اور لائک کی بارش ہو جاتی جسے دیکھ کر مجھے بے حد خوشی ہوتی اور ان کا جواب دیتے دیتے کب فجر کی اذان ہو جاتی معلوم ہی نہیں ہوتا تھا۔ اس شعر کو بھی میں نے اپنے ذہن میں محفوظ کر لیا۔ رات کو حسب معمول میں نے اپنی ایف۔ بی پوسٹ شیئر کر دی۔

''مجھے معلوم تھا محسن 'وہ میرا ہو نہیں سکتا۔

مگر دیکھو، مجھے پھر بھی محبت ہو گئی اس سے۔''

اور مختصر سے وقفے میں

''واہ...واہ۔''

''بہت خوب۔''

''عمدہ..''

''بہت عمدہ۔''

میں اپنے ایف۔ بی فرینڈز کو جواب دینے میں مصروف تھی کہ میرے مسینجر پر ایک میسج آیا۔

''السلام علیکم۔''

''کیسی ہیں آپ۔؟''

''میں فیس بک کا زیادہ استعمال کرتی ہوں مسینجر پر بھی کبھی کبھی جواب دے دیا کرتی۔پہلی بار مسینجر پر پوسٹ کی تعریف کے علاوہ ذاتی کمیٹ دیکھ کر تردد محسوس ہوا۔پھر خیال آیا ضرور کوئی فرینڈ یو ہی مذاق کے موڈ میں ہوگی کیوں نہ اس کو بھی پریشان کیا جائے۔میں نے بھی اس کے سوالات کے جواب دینے شروع کیے۔''

میں فیس بک کا زیادہ استعمال کرتی ہوں مسینجر پر بھی کبھی کبھی جواب دے دیا کرتی۔ پہلی بار مسینجر پر پوسٹ کی تعریف کے علاوہ ذاتی کمیٹ دیکھ کر تردد محسوس ہوا۔ پھر خیال آیا ضرور کوئی فرینڈ یو ہی مذاق کے موڈ میں ہوگی کیوں نہ اس کو بھی پریشان کیا جائے۔ میں نے بھی اس کے سوالات کے جواب دینے شروع کیے۔

''وعلیکم السلام۔''

''جی الحمدللہ۔''

''آپ کیسی ہو میڈم؟''

دوسری طرف سے پھر میسج آیا۔

''میم آپ غلط سمجھ رہی ہیں۔

مجھے آپ کی پوسٹ اچھی لگتی ہے۔ کافی محنت صرف کرتی ہیں آپ اپنی پوسٹ پر لیکن آج کی پوسٹ واقعی بہت اچھی ہے۔''

اتنی ساری تعریف سن کر کافی خوشی ہوئی۔

میں نے شکریہ کا کمینٹ کرتے ہوئے لکھا

آپ کون؟

دوسری طرف سے سوالیہ نشان کے ساتھ کمینٹ آیا۔

''کمال ہے ہم آپ کی فرینڈ لسٹ میں ہیں اور آپ کو معلوم ہی نہیں ہے محترمہ؟۔''

میں نے فخریہ لہجے میں جواب لکھا۔

''جی ہماری فرینڈ لسٹ اتنی طویل ہے کہ معلوم ہی نہیں رہتا کون کون شامل ہے۔''

دوسری طرف سے پھر سے ایک کمینٹ آیا۔

''اچھا ایک بات بتائیں آپ شاعری کرتی ہیں۔؟

مطلب یہ پوسٹ آپ خود لکھتی ہیں یا کاپی پیسٹ کرتی ہیں''۔

''میں خود ٹائپ کرتی ہوں۔''

میں نے جواب میں لکھا۔اسکرین پر مبصرہ کا کال شو کرنے لگا اس کا کال ریسیو کیا۔

''ہیلو۔مِس فیس بک سب سے پہلے تو میں معذرت چاہتی ہوں آپ کو اتنی رات کو پریشان کیا۔وہ دراصل بات یہ ہے کہ مجھے ہسٹری کی کتاب چاہیے کوثر سے کیا تم مجھے کوثر کا نمبر دے سکتی ہو۔؟

میں نے جھنجھلاتے ہوئے اس سے کہا۔

''اف ....یہ ہسٹری ....تم لوگوں کو چین نہیں ہے۔؟ رات میں بھی''۔رات میں بھی کوئی ہسٹری پڑھتا ہے۔رات میں تو ایف۔بی کی ہسٹری پڑھوں۔!!''

چلیے تو مِس فیس بک آپ ہی بتا دیجیے اپنی فیس بک کی ہسٹری؟

مبصرہ نے پھر میری ٹانگ کھینچی اور اتراتے ہوئے کہا۔

''آپ کو کیا معلوم ہوگا ہم ہی آپ کو بتاتے ہیں۔آپ کی ہسٹری۔مطلب فیس بک کی ہسٹری۔

صبح کالج میں داخل ہوتے ہی میں نے سیدھے لائبریری کا رخ لیا۔ فرینڈز کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ مجھے آج بہت برا لگ رہا تھا چونکہ آج میں نے اپنی سب سے اچھی دوست سے بالکل بھی بات نہیں کی تھی۔آج پورے دن میں خود اپنے آپ سے ہی ناراض رہی۔اور دن کی اپنی مصروفیات سے فارغ ہونے کے بعد میں نے رات ہوتے ہی معمول کے مطابق اپنی پوسٹ لگا دی۔

فیس بک'' Zuckerberg Mark اور ان کے دوستوں کے ذریعہ 2004 میں تیار کی گئی تھی سمجھی مِس فیس بک۔اور یہ سوشل نیٹ ورکنگ سائٹ ہے ،جس کو 2006 تک ،''ہارورڈ یونیورسٹی'' کے طلبا و طالبات کیلیے ہی مخصوص رکھا گیا تھا،اور موجودہ تناظر میں کہا جائے تو یہ آپ جیسی شخصیات کے لیے مخصوص ہو کر رہ گئی ہے۔''

اس کی باتیں مجھے گراں گزری اور میں نے مبصرہ کو کوثر کا نمبر بتائے بغیر ہی فون کاٹ دیا اور دل ہی دل میں اسے برا کہنے لگی۔

''وہ سمجھتی کیا ہے۔اپنے آپ کو صبح ملنے دو بات تک نہیں کروں گی اس سے۔

اور موبائل کا ڈاٹا بند کر جلدی ہی سوگئی۔

صبح کالج میں داخل ہوتے ہی میں نے سیدھے لائبریری کا رخ لیا۔فرینڈز کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ مجھے آج بہت برا لگ رہا تھا چونکہ آج میں نے اپنی سب سے اچھی دوست سے بالکل بھی بات نہیں کی تھی۔آج پورے دن میں خود اپنے آپ سے ہی ناراض رہی۔اور دن کی اپنی مصروفیات سے فارغ ہونے کے بعد میں نے رات ہوتے ہی معمول کے مطابق اپنی پوسٹ لگا دی۔

''شادماں لوگ میرے زخم سے دلچسپی کیوں
اس کا پتھر ہے، مراسر ہے، تیرا کیا ہے''

''السلام علیکم۔''

کیسی ہیں آپ۔؟

''واہ کیا بات ہے۔''

آج کی پوسٹ تو نہایت حسین ہے۔

اس کا پتھر ہے؟

کس کا پتھر ہے محترمہ''

میرے مسینجر پر کل کی طرح اس آئی۔ڈی سے پھر سے مسیج آنا شروع ہو گئے۔

اپنا ذہن دوسری طرف لگانے کی غرض سے میں نے بھی جواب صحیح صحیح تحریر کر کے سینڈ کر دیے۔

معلوم نہیں لفظوں کی اتنی شیرینی زبان میں پہلے کبھی نہیں سنی تھی ان الفاظ میں کیا جادو تھا کہ میں مسیجز کے جواب دینے سے خود کو روک نہیں پاتی تھی۔

اب روز کا معمول بن گیا۔جیسے ہی میں پوسٹ کرتی مسینجر پر مسیجز کی بارش ہو جاتی اور مجھے بھی اپنی پوسٹ کی تعریف سننا اچھا لگتا۔حسب معمول میں نے آج بھی اس شعر سے اپنی پوسٹ لگائی تھی۔

اس نے توڑا وہ تعلق جو میری ذات سے تھا
اس کو رنج نا جانے میری کس بات سے تھا!
لاتعلق رہا لوگوں کی طرح وہ بھی مجھ سے
جو اچھی طرح واقف میرے حالات سے تھا۔''

حسب معمول میسج آیا کہ یہ جو آپ پوسٹ کرتی ہیں یہ آپ فیل بھی کرتی ہیں یا یوں ہی بغیر پڑھے لگا دیتی ہیں۔''؟

میں نے جھنجلاتے ہوئے جواباً لکھا۔

''یہ کس طرح کے کمینٹ کر رہے ہیں آپ؟''

''ارے میرا مطلب وہ نہیں تھا۔ آپ تو ناراض ہوگئیں میرے کہنے کا مطلب یہ تھا اگر آپ اس کی تشریح کرسکتی ہیں تو پلیز مجھے بھی کچھ سمجھا دیا کریں میں تو اردو کیا انگریزی زبان بھی ٹھیک سے نہیں جانتا ہوں۔ اگر آپ کو برا لگا ہے تو معافی چاہتا ہوں سوری!!''

میں نے اس کے کسی بھی میسج کا جواب نہیں دیا صبح کو جب میں نے اپنا نیٹ آن کیا تو مسیجز کے انبار لگے ہوئے تھے۔ میرے مسینجر پر پورے 125 مسیجز تھے اس شخص کے جس کا مجھے نام تک نہیں معلوم تھا۔ بس وال پر سلطان لکھا ہوا تھا۔ لیکن نہ جانے لفظوں کے ذریعہ کس طرح کا تعلق ہو گیا تھا جہاں نہ چاہتے ہوئے بھی ان الفاظ کی شیرینی کو صرف وقتی طور پر ہی صحیح کیوں قبول کر رہی تھی جس پر کس قدر نہ چاہتے ہوئے بھی وقت ضائع کر رہی تھی۔ ہر روز کی طرح آج کی پوسٹ پر بھی میں نے بہت محنت صرف کی اور کافی محنت کرنے کے بعد مجھے فانی کے دیوان میں ایک شعر پسند آیا۔

''ہر مصیبت کا دیا ایک تبسم سے جواب
اس طرح گردش دوراں کو رلایا میں نے''

اس اجنبی شخص نے آج کوئی میسج نہیں کیا۔ لیکن مجھے اس کے میسج کی عادت ہو گئی تھی۔ کافی دیر انتظار کرنے کے بعد بھی کوئی میسج نہیں آیا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی بیش قیمتی چیز کھو گئی ہو۔ اچانک زور زور سے ہنسنے کی آواز سنائی دی میں ڈر گئی۔ اور میری ہمزاد زور زور سے ہنستے ہوئے میرے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی اور مجھ سے کہنے لگی۔'' تجھے محبت ہو گئی ہے!۔

مجھے حیرت ہے تجھے ان طلسمات کی دنیا سے محبت ہوئی؟۔ میں نے اپنا سر کھسوٹتے ہوئے کہا۔

نہیں......نہیں...... یہ سب جھوٹ ہے۔

میں، وہ بھی محبت۔؟

اور تمھیں کیا معلوم یہ آج کے نیٹ سسٹم کے بارے میں۔ یہ لفظوں کی دنیا ہے۔ جہاں کوئی بھی کسی سے بھی صرف لفظوں سے جڑا ہوتا ہے۔ جذبات یہاں محسوس تو کیے جا سکتے ہیں لیکن وہ بھی لفظوں تک ہی محدود رہتے ہیں۔

اور ہاں تم جس کو عشق کا نام دے رہی ہو وہ عشق کیسے ہو سکتا ہے۔؟ مجھے اس شخص کا نام بھی نہیں معلوم۔ کون ہے؟ کہاں سے ہے؟ پروفائل پر کیا سب سچ ہی لکھتے ہیں۔؟ پروفائل پر تو ہم جو چاہتے ہیں وہی لکھ لیتے ہیں!!! اس میں کتنی حقیقت ہوتی ہے۔ اور کتنا جھوٹ جو ایک باشعور انسان کو بھی طلسماتی دنیا میں دھکیل دیتے ہیں۔''

مری ہمزاد ہنستی ہوئی غائب ہوگئی۔

اور میں اپنے دل کو تسلی دینے لگی جو تم کرتی ہو بالکل صحیح ہے۔ میں نے اپنا موڈ فریش کرنے کے لیے اپنی ایف۔ بی پر ایک پوسٹ لگا دی

''مجھے بھول جانے کا شوق ہے تو، شوق سے اپنا شوق پورا کروں
مجھے بھی بہت شوق ہے تیرے ہر شوق پہ اپنا شوق قربان کرنا''

پوسٹ کرنا تھا کہ اس اجنبی شخص کے میسجز کی ایک بار پھر سے لائن لگ گئی۔

السلام علیکم۔

کیسی ہیں آپ۔؟

''کون آپ جیسی عظیم ہستی کو بھلا دینا چاہے گا۔

میں معذرت چاہتا ہوں دو روز مصروف رہا آپ سے بات ہی نہیں ہو سکی اور نہ آپ کی پوسٹ دیکھ سکا۔ میرا تو دن ہی خراب ہو گیا تھا آپ کی پوسٹ جو پڑھنے کو نہیں ملی۔

آپ کو اگر برا نہیں لگے تو یہ میرا واٹس ایپ نمبر ہے۔ کم از کم آپ کی خیریت تو ملتی رہے گی۔'' اس نے مجھے اپنا واٹس ایپ نمبر سینڈ کرتے ہوئے کہا اور میں خاموش اس کے سب میسجز بس پڑھتی رہی اور دل ہی دل میں مسکراتی رہی یہی تو میری بھی حالت تھی۔ لیکن ہمزاد کی باتیں یاد آ گئی اس سبب میں نے اس کے ایک بھی میسجز کا جواب نہیں دیا۔

دل نے حکم دیا کم از کم مجھے اس کی خیریت تو معلوم کرنی چاہیے؟

لیکن بالکل خاموشی اختیار کر گئی اور برابر میسجز آتے رہے۔ میں نے چاہا بھی نیٹ ورک بند کر کے سو جاؤں لیکن دل نے گوارہ ہی نہیں کیا۔ اس خیال سے کہ خود ہی اس کے مسیجز آنا بند ہو جائیں میں بھی پوری رات بیدار رہی اور فجر میں اس کو ان فرینڈ کر کے اپنے آپ میں کافی سکون محسوس کیا اور میں نے طے کر لیا کہ اب کبھی ایف۔ بی پر پوسٹ نہیں لگاؤں گی اور مبصرہ صحیح کہتی ہے۔ مجھے پوسٹ سے زیادہ اپنے نوٹس بنانے کی

طرف زیادہ توجہ دینی چاہیے۔
دوسرے ہی روز ایک مسیج میرے واٹس ایپ پر آیا۔
''السلام علیکم۔
کیسی ہیں؟
لیکن ہم آپ سے بہت ناراض ہیں۔آپ نے ہمیں ان فرینڈ کیوں کر دیا۔؟ شاید آپ بھول گئیں کہ آج کوئی جانے نہ جانے گوگل بابا سب جانتا ہے۔چلیے خیر۔''
لیکن میں نے کوئی بھی جواب نہیں لکھا لیکن اس نمبر کو اپنے واٹس ایپ پر ایڈ کر لیا۔
اور سبھی مسیجز کو سین کرتی رہی۔اس نے ایک اردو شعر مجھے سینڈ کیا۔

یوں تو ہوں تصویر سے مطمئن
لیکن آرزو یہ ہے کہ تو روبرو آئے

اور واوین میں لکھا۔
(اس میں شاعر ویڈیو کالنگ کرنا چاہتا ہے)
تو میں نے بھی جواباً لکھا۔
''آپ واقعی بہت ایکٹیو ہیں اور ذہین بھی''
لیکن آپ فیس بک سے واٹس ایپ تک کا سفر کیوں کرنا چاہتے ہیں؟
اس سے آپ کی شرافت نہیں جھلکتی؟
لیکن دوسری طرف سے کوئی جواب نہیں آیا۔
دوسرے روز جب میں اپنے اسٹیٹس چیک کر رہی تھی تو۔اسی نمبر سے ایک تازہ اسٹیٹس پر نظر رک گئی ایک شعر لکھا ہوا تھا۔

''ترقی چاہتے ہیں اور بہت مخلص بھی ہیں ان کے
مگر اللہ جانے کیوں ابھی تک وہ نہیں سمجھے
ہمیشہ ہی ہمیں تو وہ نظر انداز کرتے ہیں
کہ جب ہوں آن لائن بھی تو ایک مسیج نہیں کرتے ہیں''

ارے واہ۔میں نے بھی ایک شعر اپنے سٹیٹس پر لگا دیا۔
دوسری طرف سے بھی اس شخص نے احمد فراز کا ایک شعر اپنے اسٹیٹس پر لگا دیا۔

رنجش ہی صحیح، دل ہی دکھانے کے لیے آ
آ پھر سے مجھے چھوڑ جانے کے لیے آ

احمد فراز کا شعر دیکھ کر دل کو بہت خوشی ہوئی اس شخص کو اردو شاعری میں دلچسپی ہے۔یوں تو اپنی خوب جمے گی۔یوں ہم لوگ ہر روز اپنے اپنے اسٹیٹس پر اپنے اپنے بیچ کی دوریاں کم کرنے کی کوشش کرتے۔کبھی وہ پوسٹ کرتا کہ۔

''تجھے ٹوٹ کر چاہا ہے اور عمر بھر چاہیں گے
ایسے ہی ہیں جاناں ہمارے انداز محبت کے''

میں اس کا جواب دینے پر مجبور ہو جاتی اور میں نے بھی اس کو ہدایت کرتے ہوئے اسٹیٹس پر لکھا۔

کیوں عشق عشق تم کرتے ہو
یہ عشق تمھیں تڑپا دے گا
تم سیدھے سادھے لڑکے ہو،
یہ تم کو روگ لگا دے گا
پھر من میں جل تھل کر دے گا
پھر جینا مشکل کر دے گا
تم ہنستے کھیلتے رہتے ہو
یہ تم کو پاگل کر دے گا

اس شخص نے جواباً میرے اسٹیٹس پر کمینٹ کرتے ہوئے لکھا۔
''ہم پاگل پن کا علاج کرانا چاہتے ہیں۔آپ کی نظر میں کوئی اچھا ڈاکٹر ہو تو پلیز بتایئے گا۔
مجھے بھی غصہ آیا اسٹیٹس پر کہنے کی ہمت ہے۔لیکن سامنے اظہار محبت کی ہمت تک نہیں اگر محبت کا جذبہ ہے تو اظہار عشق بھی ہونا چاہیے۔تب ہی پیچھے سے مری ہمزاد نے جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔
''میں نہیں کہتی تمہیں عشق ہو گیا ہے اور آج دیکھیے تم نے قبول بھی کر لیا۔میں کچھ بھی کہنے اور سننے سے قاصر تھی۔بات تو سچ تھی پر بات تھی رسوائی کی میں نے بھی طے کر لیا۔
ہاں محبت، یہ محبت ہی تو ہے جو میں اس کے ہر میسج کو سین کرتی ہوں۔بار بار موبائل فون چیک کرتی ہوں کہیں اس کا میسج تو نہیں آیا جو بے چینی مجھے رہتی ہے ظاہر ہے وہی تڑپ اس میں بھی تو ہے۔غلطی میری ہی ہے میں خود اس کی قدر نہیں کرتی۔اور مبصرہ سچ کہتی ہے میں خود ہی اس سوشل میڈیا سے آگے نکلنا نہیں چاہتی اور اپنی غلطی صحیح کرنے کی غرض سے سب سے پہلے میں نے اپنے اسٹیٹس پر شعر پوسٹ کیا۔

جسے آپ گنتے تھے آشنا، جسے آپ کہتے تھے باوفا
میں وہی ہوں مومن مبتلا، تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

اس شخص نے دوسرے ہی لمحہ رونے کی ایک ایموجی سے ریپلائی

دیا۔

اور بہت وقت بعد میں نے اس کے کمینٹ کا جواب لکھا۔

''اس میں رونے کی کیا صورت ہے۔؟''

''آپ نے مجھے جھوٹا کہا اس سے پہلے کسی نے نہیں کہا۔''

دوسری طرف سے ریپلائی آیا۔ میں نے کہا۔

''یوں بار بار کسی کو میسیج، کرنا اور فیس بک سے واٹس ایپ تک کا سفر طے کرنا۔ یہ سب جھوٹ، فریب اور مکاریاں نہیں تو اور کیا ہے۔؟ ایک خوبصورت مسکراہٹ کی ایموجی کے ساتھ اس نے کمینٹ لکھا۔

''آپ ہرگز ایسا نہ سوچیں میرا مقصد پریشان کرنا نہیں تھا''۔

میں نے جواب لکھا۔

''کیا آپ اس بات سے سو فیصدی متفق ہیں۔؟''

اس نے ''ہاں'' کہا تو میں نے اس سے خود کال کرنے کی خواہش ظاہر کی وہ تو اسی فراق میں تھا اب چونکہ میں نے بھی رضامندی ظاہر کر دی تو اس کی تو عید ہوگئی۔ ہم روز کبھی ویڈیو کالنگ تو کبھی چیٹنگ سے اپنے بیچ کی دوریاں کم کرتے۔ وہ اکثر مجھ سے ملنے کا اصرار کرتا لیکن میں ہمیشہ ٹال جاتی۔ چونکہ میں اب بھی سوشل میڈیا سے باہر نہیں نکلنا چاہتی تھی میں بھی بہت خوش تھی۔ وہ ہمیشہ مجھ سے ملنے کی خواہش ظاہر کرتا۔ لیکن فون پر اس قدر مصروف دیکھ کر گھر میں بھابی مجھ پر کچھ زیادہ ہی نظر رکھنے لگی تھی۔ مجھے بھی اب اس کی عادت سی ہوگئی تھی۔ میں نے ہمت کر کے اس سے اپنے رشتے کو آگے بڑھانے کا اصرار کیا تو اس نے مجھ سے کہا۔

پہلے تم ملو تو صحیح یوں اتنے بڑے فیصلے کرنے کے لیے ایک ملاقات تو ہونی چاہیے۔ میں بھی گھر والوں کی روک ٹوک سے پریشان تھی بہت جلد اپنے پیار کو پانا چاہتی تھی تا کہ میں اس کے ساتھ ایک خوبصورت زندگی گزار سکوں۔ اس نے مجھے ایک دن بعد ملنے کے لیے بلایا تھا۔ میں بھی بہت خوش تھی چونکہ پہلی بار اس سے ملنے جا رہی تھی۔ ایک الگ ہی خوشی تھی رات بھر یہ سوچتی رہی جس سبب نیند کوسوں دور چلی گئی۔ صبح تیار ہو کر میں نکلنے ہی والی تھی کہ مبصرہ کا کال آ گیا۔ اس نے کہا۔

"ہیلو مس فیس بک آج کالج میں وائیوا ہے تم بارہ سے دو کے بیچ میں ضرور حاضر ہو جانا۔''

یہ مبصرہ نے عجیب کشمکش میں ڈال دیا اس وائیوا کو بھی آج ہی ہونا تھا۔ اگر میں اس سے ملنے نہیں گئی تو اسے لگے گا میں سچ میں اس سوشل میڈیا سے آگے نہیں نکلنا چاہتی اور ہمارا رشتہ شروع ہونے سے پہلے ہی ختم ہو جائے گا۔ ابھی گیارہ بجے تھے اور میں نکل گئی۔

اس نے مجھے ملنے کے لیے گرانڈ ہوٹل کا ایڈریس دیا تھا۔ اس سے پہلے میں کبھی ہوٹل میں نہیں گئی تھی ایک جھجک، عجیب سی گھبراہٹ محسوس ہو رہی تھی۔ لیکن ہمت کر کے میں ہوٹل میں داخل ہوگئی سامنے ہی ایک ٹیبل خالی دیکھ کر میں وہاں بیٹھ کر اس کا انتظار کرنے لگی تب ہی سامنے ہی گاڑی پارک کرتے ہوئے وائٹ شرٹ میں وہ مجھے دکھائی دیا۔ اسے دیکھتے ہی میرے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی جلدی جلدی ہڑبڑاہٹ میں اپنے بالوں پر ہاتھ پھرنے لگی اس نے قریب آ کر میری طرف گلدستہ بڑھاتے ہوئے کہا۔

''السلام علیکم۔

کیسی ہیں آپ؟

لیجیے''

میں نے جلدی سے گلدستہ لے کر ٹیبل پر رکھ دیا اور اشارے سے اسے بیٹھنے کے لیے کہا۔ کچھ دیر کی خاموشی اختیار کر کے اس نے میرے چہرے کی طرف دیکھا اور کھانستے ہوئے اس نے گفتگو شروع کی۔

ہاں تو محترمہ، آپ سوشل میڈیا پر تو کافی ایکٹیو رہتی ہیں۔ ایسا لگتا ہے آپ ہم سے مل کر خوش نہیں ہوئیں یا آپ کو ہماری شکل پسند نہیں آئی۔!!!

''نہیں نہیں ایسی بات نہیں ہے۔ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

ایک دم سے اس نے میرا ہاتھ اس زور سے دبایا۔

پھر کیسی بات ہے۔؟

ظاہر ہے ہم لوگ جس کام کے لیے آئے ہیں پہلے وہ ڈسکس کرلیں۔ اس نے بھی اپنی رضامندی کا اظہار کرتے ہوئے سر ہلا دیا۔ تو میں نے سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

آپ کیا کرتے ہیں۔؟

ارے میرا مطلب ہے آپ کام کیا کرتے ہیں۔ میں نے آہستہ سے کہا۔ اچھا تو آپ یہ جاننا چاہتی ہیں ہم کتنا کما لیتے ہیں۔ ویسے محترمہ آپ یہ سب کیوں جاننا چاہتی ہیں۔؟ مجھے ایک دم سے شرم سی محسوس ہوئی میں اسے سمجھنا چاہتی تھی لیکن وہ شاید اس وقت کچھ سمجھنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ میں بھی بہت نروس ہو رہی تھی اس لیے کچھ بھی کہے بغیر اس کی ہر ایک بات پر مسکراتے ہوئے نفی میں سر ہلانے لگی۔ اس نے کہا کیا تم مجھ پر بھروسہ کرتی ہو میں نے کہا ''خود سے زیادہ۔''

''اس نے کہا تو ایک ڈرنک تو بنتی ہے۔'' اور ہاں اب مدعے پر آتے ہیں۔ میرے کچھ کہنے سننے سے پہلے ہماری ممی آپ سے ملنا چاہتی

ہیں۔کیا کل آپ ان سے ملنے آسکتی ہیں محترمہ۔؟

''مطلب ابھی اور ملاقات کرنی باقی ہے۔؟ آپ نے تو مجھ سے ایسا کچھ نہیں کہا تھا۔؟''میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''آپ کو ڈرنے کی کوئی بات نہیں میں سب سنبھال لوں گا۔اب چلیں۔؟ کل شام چھ بجے ملتے ہیں میری طرف دیکھتے ہوئے۔آنکھوں کے اشاروں سے اس نے پوچھا۔

آج رات عجیب سی بے چینی رہی کیا معلوم اس کی ممی مجھے پسند بھی کریں گی یا نہیں۔کہیں انھوں نے مجھے ناپسند کر دیا تو۔؟ایسی بے چینی مجھے کبھی محسوس نہیں ہوئی میں نے اپنی تنہائی کو دور کرنے کے لیے بہت وقت بعد ایف۔بی۔پر پوسٹ لگائی کہ۔

''ہر نفس عمر گزشتہ کی ہے میت فانی
زندگی نام ہے مر مر کے جیے جانے کا''

بہت وقت بعد ایف۔بی۔پر مری پوسٹ دیکھ کر مرے فرینڈ نے کمینٹ کی لائن لگا دی پوسٹ پر کمینٹ کی تعداد دیکھ کر جو خوشی ہوا کرتی تھی نہ جانے کیوں آج وہ خوشی نہیں ہو رہی تھی۔بس ایک ہی بات ذہن میں رقص کر رہی تھی کہ اس کی ممی نے مجھے پسند نہیں کیا تو میں مر ہی جاؤں گی۔رات کیا دن گزارنا بھی مشکل ہو رہا تھا جیسے ہی چار بجے میں بھابی سے یہ کہ کر گھر سے نکل گئی کہ'' بھابی میں مبصرہ کے گھر جا رہی ہوں نوٹس لینے کے لئے۔بھابی نے مجھ سے کچھ نہیں کہا لیکن بھائی جان بولے کب تک لوٹ آؤ گی۔؟"میں نے کہا بس جلدی آتی ہوں بھائی جان''۔

اس نے مجھے ایڈریس بتا دیا تھا۔لیکن مجھے کچھ جھجھک سی محسوس ہوئی تو میں نے اسے فون کر لینے آنے کی فرمائش ظاہر کی وہ مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوا۔میں بھی اسے دیکھ کر مسکرا دی۔چھوٹی چھوٹی گلیوں سے ہوتے ہوئے قدیم زمانے کے مطابق تعمیر شدہ گھر کے باہر کھڑے ہو کر مجھے عجیب عجیب خیالات نے گھیر لیا۔اس کے چھوٹے سے گھر میں داخل ہوتے ہی میں نے محسوس کیا گھر میں اس کے اور میرے علاوہ کوئی نہیں ہے میں نے ڈرتے ہوئے اس سے پوچھا آپ کی ممی کہاں ہے۔؟

گھر کی حالت کافی بگڑی ہوئی تھی کوئی بھی چیز اپنی جگہ پر نہیں تھی جسے دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ شاید ہی کوئی خاتون یہاں رہتی ہوگی۔

مجھے کچھ گھبراہٹ سی محسوس ہوئی اچانک میرا موبائل بجنے لگا اور اسکرین پر مبصرہ کا نمبر شو کرنے لگا۔میں نے جلدی سے کال ریسیو کر کے ہیلو کہا۔مبصرہ میرے اوپر گرجنے لگی۔

''اے مس فیس بک کہاں ہے۔؟اب آن لائن رہتے رہتے گھر سے غائب بھی رہنے لگی ہو۔؟ میں کب سے تمھارے گھر پر تمھارا انتظار کر رہی ہوں۔'' کہاں ہو جلدی آجاؤ۔

میں نے اچھا کہتے ہوئے فون کاٹ دیا۔

اور کچھ کہے بغیر فوراً وہاں سے اٹھ کر چل دی وہ مجھے روکتا رہ گیا لیکن میں نے اس کی ایک نہ سنی اور ہڑبڑاتی ہوئی گھر واپس آئی تو بھائی جان اور بھابی دونوں آپس میں باتیں کر رہے تھے۔میں گھبرائی ہوئی تھی مجھے مبصرہ کہیں نظر نہیں آ رہی تھی میری نظریں اسے تلاش کرنے لگی۔

''تم مبصرہ کے گھر گئی تھی اور وہ ادھر آئی تھی تمھارے لیے نوٹس لے کر یہ لو تمھارے نوٹس بھابی نے مجھے نوٹس دیتے ہوئے کہا۔''ابھی گئی ہے وہ بھی تمھارا انتظار کر کے۔تم کہاں گئی تھی۔؟

تب ہی بھائی جان بول اٹھے۔

"ارے بتا کر تو گئی تھی۔اب آئندہ میسیج کر کے پوچھ لیا کرنا۔"

اچھا بھائی جان۔

کہتے ہوئے میں اپنے کمرے میں چلی گئی۔اور خدا کا شکر ادا کیا کہ مبصرہ نے بات سنبھال لی ورنہ بھائی جان۔!!!

اور تکیے میں منہ ڈھانپ کر رونے لگی آج اگر مبصرہ صحیح وقت پر کال نہیں کرتی تو معلوم نہیں کیا ہو جاتا۔

تبھی اس کا میسیج آیا۔

''کیا ہوا۔؟ کیا بات ہوئی جو آپ اچانک اس طرح سے چلی آئی۔؟''

ناراض ہونے کہ وجہ تو بتائیں۔؟

مگر معلوم نہیں کیوں مجھے خود اپنے آپ سے ہی نفرت ہو رہی تھی اور اپنی ہمزاد کی باتیں رہ رہ کر یاد آ رہی تھی۔میں نے اس کے کسی بھی میسیج کا جواب نہیں دیا۔

مسلسل کئی روز بے چینی و بے قراری اور غور و فکر کے بعد میں نے اسے میسیج کیا۔

''آئندہ کسی سے بھی فیس بک اور واٹس ایپ پر میسیج نہ کرنا۔

□□□

Mehmooda Qureshi
22/78 Dholi Khar Agra
Fort Agra- 282003 (U.P)
Mob:7417912943

لذیذ پکوان

فرائیڈ پنیر

اجزا: پنیر(چوکور کٹا ہوا)700 گرام،بیسن (چھنا ہوا) ایک پیالی، میدہ (چھنا ہوا)حسبِ ضرورت، ہرا دھنیا آدھی گڈی، پودینہ آدھی گڈی، پسا ہوا سفید زیرہ ایک چائے کیا چمچہ، کٹا ہوا سفید زیرہ آدھا چائے کا چمچہ، اجوائن آدھا چائے کا چمچہ، پسی ہوئی ہلدی ایک چائے کا چمچہ، کٹی ہوئی لال مرچ ایک کھانے کا چمچہ، نمک حسبِ ذائقہ

تیل تلنے کے لیے، پسی ہوئی لال مرچ چھڑکنے کے لیے، کھیرے، ٹماٹر (چوکور کٹے ہوئے) ہمراہ پیش کرنے کے لیے، سلاد پتے، کھیرے سجانے کے لیے

ترکیب: ایک پیالے میں میدے اور پنیر کے علاوہ باقی تمام اجزاء ملائیں اور پانی ڈال کر گاڑھا آمیزہ بنالیں۔ پنیر کے ٹکڑوں کو پہلے آمیزے، پھر میدے میں لپیٹیں۔ کڑاہی میں تیل گرم کریں اور انھیں سنہری تل کر نکال لیں۔ پنیر کے ایک ٹکڑے پر ٹوتھ پک لگائیں اس پر ایک، ایک ٹکڑا کھیرا اور ٹماٹر لگادیں۔ اس عمل کو دہراتے ہوئے باقی پنیر بھی تیار کرلیں۔ سرونگ پلیٹ کو سلاد پتے اور کھیرے سے سجائیں۔ اس پر پنیر رکھیں اور لال مرچ چھڑک کر پیش کریں۔

کھوئے کی سویاں

اجزا: سویاں 250 گرام، کھویا 250 گرام، گھی 150 ملی لیٹر، دودھ 250 ملی لیٹر، چینی حسب پسند، بادام گری 30 گرام، الائچی سبز 6 دانے، زعفران چائے کا چوتھائی چمچہ

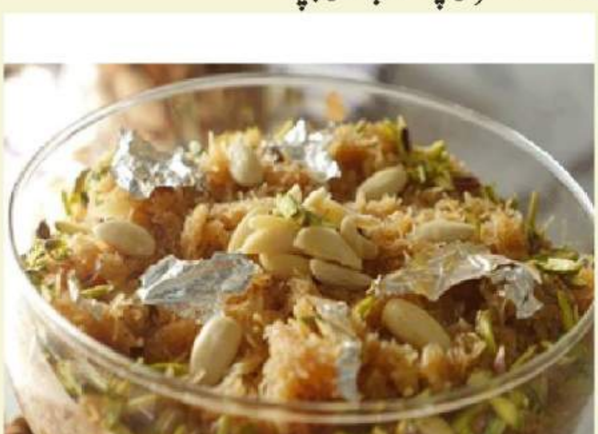

ترکیب: ایک دیگچی میں گھی ڈال کر گرم کیجیے اور اس میں سبز الائچی ثابت ہی ڈال دیجیے۔

جب الائچی پک کر موٹی ہو جائے تو سویاں ڈال دیجئے اور بھون کر اتار لیجیے۔ اب ان سویوں میں دودھ اور تھوڑا سا پانی ملا کر دوبارہ چولہے پر چڑھا دیجیے۔ جب سویاں گل جائیں اور دودھ اور پانی خشک ہو جائے تو چینی اور کھویا ڈال کر چمچے سے اچھی طرح ملا دیجیے۔

چمچہ برابر ہلاتے رہیے ورنہ سویاں نیچے سے لگ جائیں گی۔

چینی کا پانی خشک ہو جائے تو زعفران پیس کر اور بادام کی گریاں باریک کتر کر ڈال دیجیے۔ آگ بہت ہلکی کر دیجیے۔ سویاں خشک ہو جائیں تو اتار لیجیے۔ کھوئے والی مزے دار سویاں تیار ہیں۔

رس ملائی

اجزا: دودھ چار کپ، چینی 1 کپ، الائچی (پسی ہوئی) 4، خشک دودھ ایک کپ، میدہ ڈیڑھ چائے کا چمچ، بیکنگ پاوڈر ایک چائے کا چمچ، انڈہ ایک عدد، پستہ (کٹا ہوا) تھوڑا سا

ترکیب: سب سے پہلے چار کپ دودھ میں ایک کپ چینی اور چار پسی الائچی ڈال کر پکنے دیں۔

ایک کپ خشک دودھ کو چھان لیں اور اس میں میدہ اور بیکنگ پاوڈر ملائیں۔

ان سب کو مکس کر کے ان میں ایک چمچ گھی ڈالیں اور ہاتھوں سے اچھی طرح ملیں۔

پھر ان میں انڈہ شامل کریں اور اسے دوبارہ اچھی طرح مکس کر لیں۔

پھر اس کی چھوٹی چھوٹی رس ملائیاں بنائیے۔

اب انھیں پکتے ہوئے دودھ میں ڈال دیں اور تین سے چار منٹ تک پکائیں۔

جب دودھ ابلنے لگے تو ایک دفع ہلا دیں۔

ہلکی آنچ پر پکائیں اور تیار ہونے پر اتار لیں۔ ٹھنڈا ہونے پر پستہ چھڑک کر پیش کریں۔

چکن بالس

اجزا: آلو ایک پاو، چکن تین سے چار بوٹیاں ابلی ہوئیں
کالی مرچ پسی ہوئی ایک چمچ
چائنیز نمک آدھا چمچ
نمک آدھا چمچ
ڈبل روٹی کا چورہ
انڈا ایک عدد

ترکیب: آلو کو اُبال کر میش کر لیں پھر اس میں کالی مرچ، چائنیز نمک، چکن کے ریشے اور نمک ملا کر بالز بنا لیں۔

بالز کو انڈے میں ڈپ کریں۔

ڈبل روٹی کا چورہ لگائیں۔

تیل گرم کر کے فرائی کر لیں۔

ہلکے براؤن ہونے پر نکال کر چٹنی کے کیچپ کے ساتھ پیش کریں۔

(بحوالہ: www.kfoods.com)

□□□

ڈاکٹر احسان رؤف

نزف الدم بعد سن یاس
(Post Menopausal Bleeding)

سن یاس(Menopause) کا عرصہ مکمل ہونے کے ایک سال بعد مہبل(Vagina) سے جریان الدم(Bleeding) ہونے کو نزف الدم بعد سن یاس(Post Menopausal Bleeding) کہتے ہیں۔نزف الدم بعد سن یاس چاہے کم ہو یا زیادہ ہو ہمیشہ اس کو اہمیت دینا چاہیے اور ہمیشہ ماہر امراض نسواں (Gynecologist) سے رجوع کرنا چاہیے۔ایسا دیکھا گیا ہے کہ نزف الدم بعد سن یاس کے تقریباً ایک تہائی مریضوں کا سبب سرطان(Cancer) ہوتا ہے ۔اسی طرح سے ایسی خواتین جن میں 55 سال کے بعد بھی طبعی حیض جاری ہے تو اس کے لیے بھی ماہر امراض نسواں سے رجوع کرنا چاہیے۔

اسباب(Causes)

ہندوستان میں نزف الدم بعد سن یاس کا سب سے عام سبب سرطان عنق الرحم (Carcinoma of Cervix) ہے جبکہ مغربی ممالک میں نزف الدم بعد سن یاس کا سب سے عام سبب Endometrial Atrophy ہے۔جبکہ اگر پوری دنیا میں دیکھا جائے تو نزف الدم بعد سن یاس کا سب سے عام سبب سرطان عنق الرحم (Carcinoma of Cervix) ہے۔ نزف الدم بعد سن یاس کے اسباب درج ذیل ہیں۔

- ☆ Senile Endometritis
- ☆ Atrophic Endometrium
- ☆ Endometrial hyperplasia
- ☆ Dysfunctional Uterine bleeding
- ☆ Carcinoma of Cervix, Endometrium, Vagina, Vulva and Fallopian Tube
- ☆ Sarcoma of Uterus
- ☆ Uterine Polyp
- ☆ Tubercular endometritis
- ☆ Cervical erosion and polyp
- ☆ Senile vaginitis
- ☆ Decubitus ulcer
- ☆ Pessary یا Intrauterine contraceptive Device کا رحم میں رہ جانا
- ☆ Oestrogen ہارمون لینے کے بعد روک دینا۔
- ☆ تقریباً 25 فیصد مریضوں میں نزف الدم بعد سن یاس کا سبب نامعلوم ہوتا ہے۔

سرطان عنق الرحم (Carcinoma of Cervix) اور

Carcinoma of Endometrium کی علامات میں فرق

سرطان عنق الرحم کی علامات

☆مباشرت کے بعد جریان الدم(Bleeding) کا ہونا۔

☆مہبل سے irregular bleeding ہونا۔

☆مہبل سے بدبودار سیلان(Foul smell discharge) ہونا۔

☆رحم میں پیپ کا جمع ہونا جس کو طبی اصطلاح میں Pyometra کہتے ہیں۔

☆وزن کا بہت زیادہ کم ہونا۔

Carcinoma Endometrium کے علامات

☆سن یاس کے بعد مہبل سے جریان الدم کا ہونا۔

☆مہبل سے irregular bleeding ہونا۔

☆رحم میں پیپ(Pus) کا جمع ہونا۔

☆اس صورت میں عام طور پر وزن کی کمی نہیں ہوتی ہے۔

نزف الدم بعد سن یاس (Post Menopausal bleeding) کا سبب پتہ کرنے کے لیے درج ذیل چیزوں کے بارے میں پتہ کیا جاتا ہے۔

سب سے پہلے اس بات کا پتہ لگایا جائے کہ جریان الدم (Bleeding) مہبل (Vagina) سے ہو رہی ہے یا پیشاب کے راستہ سے ہو رہی ہے۔

☆تفصیلی روداد (Detailed History)

☆ سن یاس(Menopause) کی عمر کا پتہ کیا جائے۔

☆سن یاس سے پہلے حیض کے بارے میں پوچھا جائے، کتنی مقدار میں Bleeding ہوتی تھی اور کتنی بار ہوتی تھی۔

☆ پیشاب سے متعلق پریشانیوں کے بارے میں پتہ کیا جائے کہ پیشاب کرنے میں تکلیف، پیشاب کتنی بار جانا پڑتا ہے اس کے بارے میں مریضہ سے پوچھا جائے۔

☆Estrogen ہارمون کے استعمال کرنے کے بارے میں مریضہ سے پوچھا جائے۔

☆ سرطان کی خاندانی روداد (Family history) کے بارے میں پتہ کیا جائے۔

عمومی امتحان (General Examination)

مریضہ کا عمومی امتحان کیا جائے اس میں سب سے پہلے گلہری اور گردن کے غدد لمفاویہ (Lymph nodes) کو چھو کر محسوس کیا جائے۔ یہ بڑھے ہوئے تو نہیں ہے بطن(Abdomen) کا امتحان کرنے پر بطن

کے زیریں حصے میں سوجن کو محسوس کیا جائے ۔ سوجن Uterine Sarcoma یا Pyometra کی وجہ سے ہوسکتی ہے۔

Speculum Examination

Speculum ایک آلہ ہے جس کے ذریعہ سے عنق الرحم (Uterine Cervix) کا معائنہ کیا جاتا ہے اس امتحان میں اگر عنق الرحم میں کوئی Growth نظر آئے تو اس سے Biopsy لیکر اس کی Histology کی جانچ کرائی جاتی ہے تاکہ سرطان (Cancer) کا پتہ چل سکے ۔اگر عنق الرحم دیکھنے میں طبعی ہو ہو تو اس صورت میں Cervical اور Endocervical smear کے ذریعہ سے Dysplasia یعنی کینسر سے پہلے کی صورت کا پتہ لگایا جاتا ہے۔

مخصوص جانچیں (Special Investigations)

☆Transvaginal Sonography

اس کے ذریعہ سے Endometrium کی Thickness کا پتہ لگایا جاتا ہے ۔اگر Thickness ۵ ملی میٹر سے کم ہوتو اس کا سبب Endometrial Atrophy ہوسکتی ہے ۔اگر Thickness 5 ملی میٹر سے زیادہ ہو، رحم میں رطوبت ہو، رحم کی ساخت غیر طبعی ہوتو سرطان کو پتہ کرنے کے لیے دوسری جانچیں بھی کرائی جائے۔

☆Saline Infusion sonography

یہ جانچ صرف Sonography کے مقابلہ میں زیادہ یقینی ہوتی ہے اور اس میں Biopsy بھی لی جاتی ہے۔

☆Endometrial Biopsy

Pipelle cannula کے ذریعہ یہ جانچ کی جاسکتی ہے۔ اس جانچ کی خاص بات یہ ہے کہ OPD میں آنے والے مریضوں میں بھی کی جاسکتی ہے۔اس جانچ سے Endometrium کے سرطان کا پتہ چلتا ہے۔

☆ CT اور MRI

ایسے مریض جن میں سرطان کا شبہ ہوتا ہے ان مریضوں میں CT اور MRI کی جانچ کرائی جاتی ہے۔

علاج (Treatment)

اگر سبب کا پتہ چل جاتا ہے تو سبب کے مطابق علاج کیا جائے ۔اگر سبب کا پتہ نہ چل پائے اور Bleeding کم ہورہی ہوتو اس صورت میں مریضہ کی نگرانی کی جاتی ہے اور اس کو ہدایت دی جاتی ہے کہ وہ ڈاکٹر کی نگرانی میں رہے۔اگر Bleeding بار باراور متواتر ہوتے رہے تو بہتر ہے کہ جراحت (Surgery) کے ذریعہ Ovary, Uterus, Fallopian tube کو جسم سے باہر نکال دیا جائے۔

حوالہ جات (References)

1 ڈی سی دتا، ٹکسٹ بک آف گائنی کولوجی، ساتواں ایڈیشن، جے پی بردرس میڈیکل پبلشرس، نئی دہلی، 2016، صفحہ 462-464
2 حکیم سید محمد عبدالرزاق، تعلیم القابلہ موسوم بہ معالجات امراض نسواں، جید برقی پریس، دہلی، 1937، صفحہ 127-129
3 ڈاکٹر محمودہ انظر، رہنما امراض نسواں، ادارہ کتاب الشفا، نئی دہلی، 2009، صفحہ 87-88
4 اسٹنڈرڈ یونانی میڈیکل ٹرمینالوجی، سی سی آر یو ایم، نئی دہلی، 2012، صفحہ 169
5 ٹے برس سائکلو پیڈیک میڈیکل ڈکشنری، 21 واں ایڈیشن، ایف۔ اے۔ ڈے وس، کمپنی، فلاڈیلفیا، 2005، صفحہ 1857

□□□

Dr. Ehsan Rauf
476/6C Behind Madeh Ganj
Police Chowki, Sitapur Road
Lucknow-226020 (U.P)

حسن کی نگہداشت

بالوں کے لیے کیلشیم کیوں ضروری ہے؟

کیلشیم انسانی جسم کی تشکیل میں انتہائی اہمیت کے حامل کیمیائی عناصر میں سے ایک ہے، اور یہ دانتوں اور ہڈیوں کی نشونما کے لیے ضروری ہے، پٹھوں کے سکڑنے، اعصابی تحریکوں کی ترسیل اور خون جمنے کے عمل میں مدد کرتا ہے۔ کیلشیم کی کمی عام طور پر صحت کے مسائل کا باعث بنتی ہے جیسے آسٹیوپوروسس، رکٹس، پٹھوں کی کمزوری، ڈیری مصنوعات، پنیر وغیرہ کیلشیم سے بھرپور غذائیں ہیں، اور انھیں تازہ یا ڈبے میں بند مچھلیوں، کچھ جوس اور مخصوص قسم کی سبزیوں جیسے بروکولی، پالک اور بند گوبھی میں شامل کیا جاتا ہے۔

بالوں کے لیے کیلشیم کے فوائد

اس میں کوئی شک نہیں کہ وٹامنز اور منرلز سے بھرپور متوازن غذا جیسے: زنک، آئرن اور کیلشیم صحت مند بالوں کو برقرار رکھنے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔

☆ حالیہ تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ کیلشیم سے بھرپور صحت مند غذا بالوں کی نشوونما کو فروغ دیتی ہے اور بالوں کو گرنے سے روکتی ہے۔ اینڈروجینک ہارمون بالوں کی نشوونما کو متحرک کرتا ہے، کیونکہ کیلشیم اینڈروجینک ہارمون کی تشکیل اور تعمیر کے بنیادی بلاکس میں سے ایک ہے۔

☆ کیلشیم بعض خامروں کی تشکیل میں جاتا ہے جیسا کہ انزائم بائیوٹن، جو نئے خلیوں کی نشوونما کو فروغ دیتا ہے اور اس وجہ سے نئے بالوں کی تشکیل ہوتی ہے۔

☆ ٹوٹے ہوئے بالوں کا علاج کرتا ہے۔

☆ یہ بالوں کو نمی بخشتا ہے اس طرح خشکی اور بالوں کا روکھا پن کم ہوتا ہے۔

کیلشیم سے بھرپور غذائیں

بالوں کے لیے کیلشیم کے فوائد صحت مند اور مضبوط بالوں کے لیے ہیں اور بالوں کے لیے کیلشیم کے فوائد حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ کیلشیم سے بھرپور ان اہم ترین ذرائع کو جانا جائے جنھیں زیادہ سے زیادہ کیلشیم حاصل کرنے کے لیے کھانوں میں شامل کرنا چاہیے۔ ہم جانتے ہیں کہ کیلشیم ہمارے جسم میں قدرتی تناسب میں موجود ہوتا ہے لیکن اسے مختلف غذائی ذرائع سے معتدل مقدار میں، حاصل کرنا ضروری ہے۔ ان میں سے چند ذرائع یہ ہیں:

دودھ کی بنی ہوئی اشیا

دودھ کی مصنوعات سے مراد وہ غذائیں ہیں جن میں دودھ ان کی تیاری کا بنیادی جزو ہے، جیسے پنیر، دہی، کریم، دودھ، جہاں دودھ سے منسلک بہت زیادہ کیلشیم کے ذرائع ہیں، اور دہی کے ہر کپ میں کیلشیم کا تناسب 245 گرام، اور گائے کے پورے دودھ کے ہر کپ میں 352 ملی گرام۔ پرمیزان پنیر میں 331 ملی گرام کیلشیم ہوتا ہے۔

سبزیاں

سبز پتوں والی سبزیاں کیلشیم اور آئرن کا بھرپور ذریعہ ہیں۔ پکی ہوئی پتوں والی ہری سبزیوں کے ہر کپ میں 266 ملی گرام کیلشیم ہوتا ہے۔

خالی پیٹ زیتون کا تیل پینے کے فوائد

زیتون کا تیل صحت کے لیے بہت فائدہ مند مانا جاتا ہے جس کی وجہ اس میں موجود فیٹی ایسڈز، وٹامنز اور دیگر اجزاء شامل ہیں۔

درحقیقت خالی پیٹ ایک کھانے کے چمچ زیتون کے تیل کو پینا بہت سے فوائد کا حامل ہوتا ہے۔

توند سے نجات

زیتون کے تیل میں فیٹی ایسڈز کی مقدار بہت زیادہ ہوتی ہے جو کہ زیادہ کھانے سے روکتی ہے، جس کے نتیجے میں یہ گھی کا بہترین متبادل تو ہے ہی، تاہم اسے خالی پیٹ پینا بہت کم عرصے میں توند کو گھٹانے میں مدد دیتا ہے۔

آنتوں کو ٹھیک کرے

خالی پیٹ زیتون کے تیل کا ایک چمچ پینا ان خلیات کو نقصان سے بچاتا ہے جو کینسر کا باعث بن سکتے ہیں، اسی طرح یہ آنتوں کے نظام کو ٹھیک کر کے قبض سے نجات دلانے میں بھی مددگار ثابت ہوتا ہے۔

جلد، بال، ناخن اور ہڈیوں کو بہتر بنائے

زیتون کا تیل جلد، ناخنوں اور بالوں کے لیے بھی فائدہ مند ہے، یہ ان کی ملائمت واپس لانے کے ساتھ نقصانات کی مرمت کرتا ہے، ان کی نمی بحال کرتا ہے جبکہ بالوں کی نشوونما کو بھی بڑھاتا ہے۔ ویسے تو اسے ہیئر یا اسکن ماسک کی شکل میں بھی استعمال کیا جاسکتا ہے مگر اسے پینا زیادہ مددگار ثابت ہوتا ہے۔

جگر کی صفائی

جسمانی افعال کے لیے جگر کی بہت اہمیت ہے، یہ اندرونی نظام کی صفائی کرتا ہے مگر زہریلے مواد کی صفائی کے لیے ہمیں بھی کوشش کرنا ہوتی ہے اور ایسا زیتون کے تیل سے ممکن ہے۔

جسمانی دفاعی نظام بہتر بنائیں

اس میں موجود فیٹی ایسڈز جسمانی دفاعی نظام کے مختلف افعال کو بہتر بنانے میں مدد دیتے ہیں، جس کے نتیجے میں مختلف موسمی امراض سے بچنا آسان ہو جاتا ہے۔

دل کو تحفظ دے

کولیسٹرول کی دو اقسام ہوتی ہیں، ایک ایل ڈی ایل (نقصان دہ) اور دوسری ایچ ڈی ایل (فائدہ مند)، امراض قلب سے بچنے کے لیے ایل ڈی ایل کی سطح کو کم رکھنا ضروری ہوتا ہے جبکہ دوسری کی سطح بڑھانا ہوتی ہے، اس کا ایک ذریعہ زیتون کا تیل، سبزیاں، پھل اور اجناس پر مشتمل غذا کا استعمال ہے۔

جسمانی ورم کم کرے

زیتون کا تیل جسمانی ورم میں کمی کے لیے دردکش ادویات کی طرح ہی کام کرتا ہے، ایک تحقیق کے مطابق کچھ کھانے کے چمچ زیتون کا تیل کسی دردکش دوا جتنا اثر رکھتا ہے اور یہ قدرتی علاج ہے جس کا کوئی نقصان نہیں۔

بلڈ شوگر کنٹرول کرے

زیتون کا تیل کولیسٹرول اور گلوکوز لیول کو موثر طریقے سے کم کرتا ہے، اسی لیے اسے ذیابیطس کے خلاف فائدہ مند مانا جاتا ہے۔

دماغ کو تحفظ دے

زیتون کا تیل دماغ کے لیے بھی فائدہ مند ہے، جسے بہت زیادہ آکسیجن کی ضرورت ہوتی ہے، جس کی کمی مضر صحت فری ریڈیکلز کی مقدار بڑھاتی ہے جو کہ وقت گزرنے کے ساتھ الزائمر اور دماغی تنزلی کا باعث بن سکتا ہے۔

(بحوالہ: www.kfoods.com)

تاثرات: نگر نگر سے

’خواتین دنیا‘ جون 2022 نظر نواز ہوا۔ سابقہ شماروں کی طرح یہ شمارہ بھی عمدہ اور لاجواب ہے۔ اداریہ میں عقیل صاحب نے ماحولیات کے تئیں اپنی فکر کو ظاہر کیا ہے۔ آج ہم سب ماحولیاتی آلودگی سے دوچار ہیں۔ ماحولیات سے مراد پیڑ پودے، زمین، ہوا، پانی اور وہ قدرتی اشیا ہیں جن پر انسانوں کی زندگی منحصر کرتی ہے۔ جس ماحول میں ہم رہتے ہیں اس کی حفاظت کرنا، ماحول کو صاف ستھرا اور صحت مند رکھنا ہم سب کی ذمہ داری ہے۔ حکومتی سطح پر بھی ماحول کو آلودگی سے پاک رکھنے کے لیے بہت سی کوششیں کی جارہی ہیں۔ ماحولیات کا تحفظ ہم کئی طرح سے کر سکتے ہیں مثلاً درخت اور پودوں کو لگانا، گندگی پر قابو پانے کے لیے عملی اقدامات کرنا، زرعی کیمیا کا مناسب استعمال کرنا، قدرتی توانائی کے ذرائع کا موثر استعمال کرنا، ٹریفک کے دھوئیں کو کنٹرول کرنے کے لیے عملی اقدامات کرنا، صنعتی فضلات کو قابو میں کرنا، نامیاتی زراعت اور کاشت کاری کو اپنانا ان تمام طریقوں کو اپنا کر ہم ماحولیاتی آلودگی پر قابو پاسکتے ہیں۔

ماحول کو آلودگی سے پاک کرنا ہم سب کی ذمہ داری ہے۔ ہمیں اس سمت میں اپنی ذمہ داریوں کو سمجھنا ہوگا تبھی ہم آلودگی سے پاک ماحول میں سانس لے سکیں گے۔

اس شمارے میں آٹھ مضامین شامل ہیں۔ ہر مضمون اپنے موضوع سے انصاف کرتا ہے۔ اردو صحافت اور خواتین کے تحت دو مضامین شامل کیے گئے ہیں۔ پہلا مضمون ’محمدی بیگم کی ادبی خدمات‘ ڈاکٹر عرشیہ جبین کا جبکہ دوسرا مضمون حقانی القاسمی صاحب کا ہے۔ قاسمی صاحب کا مضمون بہت عمدہ اور اعلیٰ معیار کا ہے۔ انھوں نے مضمون پر بہت محنت صرف کی ہے۔ افسانوں میں ’ہاتھ کی لکیریں‘ بہت اچھا لگا۔ صحت کے تحت مضمون بھی ماحولیات کے تئیں ہمیں بیدار کرتا ہے اور غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔ لذیذ پکوان بھی بہت پسند آئے۔ آرائش و زیبائش بھی لاجواب ہے۔ خواتین خبرنامہ میں نکہت زرین کی عمدہ کارکردگی کو نمایاں کیا گیا ہے۔

غرض کہ ’خواتین دنیا‘ میں تمام مواد عمدہ اور اعلیٰ معیار کا ہوتا ہے۔ نیک خواہشات اس ماہنامہ کے لیے۔

صبا پروین، مرشد آباد، ویسٹ بنگال

کرشنا شرما دامنی کی شاعری زندگی کے ہر رنگ کی عکاسی کرتی ہے: پروفیسر شیخ عقیل احمد

نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے صدر دفتر میں ہندی و اردو کی شاعرہ کرشنا شرما دامنی کے شعری مجموعے 'شدت عشق' کا اجرا کونسل کے ڈائریکٹر پروفیسر شیخ عقیل احمد و دیگر شخصیات کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ اس موقع پر اظہار خیال کرتے ہوئے پروفیسر عقیل نے شاعرہ کو مبارکباد پیش کی اور کہا کہ موصوفہ ہندی کی ٹیچر، رائٹر اور شاعرہ ہیں مگر اس کے ساتھ ہی اردو سے ان کا والہانہ تعلق ہے اور انھوں نے قومی اردو کونسل کے سینٹر سے اردو ڈپلوما کر کے اردو سیکھی اور اب اس زبان میں انھوں نے اتنی مہارت حاصل کر لی ہے کہ وہ اس میں بہترین شاعری بھی کرتی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ دامنی صاحبہ کی شاعری میں حسن و عشق اور زندگی کے تمام رنگ پائے جاتے ہیں۔ اردو اور ہندی شاعری میں تخاطب کا جو فرق ہے اس کو انھوں نے بہت اچھے انداز میں برتا ہے۔ پروفیسر عقیل نے کہا کہ اپنی شاعری میں انھوں نے اردو کے ساتھ ہندی شاعری کی علامات و استعارات کا بھی بھرپور استعمال کیا ہے اور اس طرح ہندی اور اردو کو قریب لانے کی بہت عمدہ کوشش کی ہے۔

اتراکھنڈ اردو اکادمی کے سابق صدر افضل منگلوری نے کہا کہ کرشنا شرما دامنی اپنی شاعری اور شخصیت کے ذریعے سماجی اتحاد کا پیغام دیتی ہیں جو ان کا امتیاز ہے۔ اردو ہندی ایکتا ٹرسٹ کے پلیٹ فارم سے اردو اور ہندی کو ساتھ لا کر مشترکہ تہذیب و ثقافت کی نمائندگی کی ان کی کاوش بھی قابل قدر ہے۔ پروفیسر شہپر رسول نے شاعرہ کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے کہا کہ ان کی تخلیق غیر معمولی ریاضت، تخلیقی جدوجہد اور عمدہ فن کاری کا نمونہ ہے۔ اردو ہندی ایکتا ٹرسٹ کی حصولیابیوں پر بھی مبارکباد پیش کی کہ اس سے دونوں زبان والوں میں بھی اتحاد و اشتراک پیدا ہوگا۔ انھوں نے کہا کہ ان کی شاعری زبانِ اردو سے ان کے عشق کی شدت کی نمائندہ ہے اور اس میں سادگی کے ساتھ حسن بھی پایا جاتا ہے۔

معروف ادیب و ناقد حقانی القاسمی نے مصنفہ کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے ان کی شاعری پر خوبصورت انداز میں اظہار خیال کیا۔ انھوں

نے کہا کہ ان کی شاعری میں عشق کے کئی رنگ ہیں۔ انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعے عورت کی داخلی سائیکی اور عشق کی وجدانی کیفیات کی بہترین عکاسی کی ہے۔ان کے اشعار موجودہ معاشرتی مسائل وموضوعات کی بھی عکاسی کرتے ہیں۔انھوں نے کہا کہ کرشنا شرما دامنی نے اپنی شاعری میں محبت کا ایک نیا باب کھولا ہے۔ عشق کے اس باب کو زندہ کیا ہے جو ہمارے ذہنوں سے محو ہوتا جارہا ہے۔ان کی شدت میں پاکیزگی اور طہارت ہے۔ڈاکٹر عبدالرشید نے کہا کہ دامنی کی شاعرانہ فکر وحدت پرستی پر قائم ہے اور وہ اپنی تخلیقات کے ذریعے سماجی ہم آہنگی کے قیام کے لیے قابل قدر کوششیں کررہی ہیں، آج ہر گھر کو ایسی دامنی کی ضرورت ہے۔ڈاکٹر مسرت نے کہا کہ کرشنا شرما دامنی کی شاعری میں غیر معمولی توانائی اور خوبصورتی پائی جاتی ہے۔ انھوں نے اپنی غزلوں میں حسن ومحبت کے معاملات کے علاوہ گردوپیش کے حالات کی بھی بہت خوبصورت ترجمانی کی ہے۔ کرشنا شرما دامنی نے کونسل کے ڈائریکٹر پروفیسر شیخ عقیل احمد کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ میرے پاس الفاظ نہیں ہیں کہ میں حقیقی معنوں میں ان کا شکریہ ادا کر سکوں۔ ان کی حوصلہ افزائی میرے لیے قیمتی سرمایہ ہے۔انھوں نے اردو زبان سے اپنی غیر معمولی محبت کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ہر ہندوستانی کے اندر اردو زندہ ہے، بھلے ہی وہ اس کا اظہار نہ کرتا ہو۔انھوں نے کہا کہ اردو دن بہ دن ترقی کررہی ہے اور ہمیں کسی اندیشے میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔انھوں نے کہا کہ ہندی والوں کو بھی ضرور اردو سیکھنی چاہیے کیوں کہ اردو سیکھنے کے بعد وہ اپنی ہندی کو بھی سنوار سکتے ہیں۔

اس موقعے پر آل انڈیا ریڈیو کے عرفان اعظمی اور ہریانہ کے سابق ایڈیشنل کمشنر محمد عرفان نے بھی اظہار خیال کیا اور شعری مجموعے کی اشاعت پر کرشنا شرما دامنی کو مبارکباد پیش کی۔آل انڈیا اردو ہندی ایکتا ٹرسٹ کے سربراہ فرید احمد فرید نے اس خوب صورت تقریب کے انعقاد کے لیے کونسل اور ڈائریکٹر کا خصوصی شکریہ ادا کیا اور فروغ اردو کے حوالے سے اپنے ٹرسٹ کی کارگزاریوں کا مختصراً تذکرہ کیا۔اس تقریب کی نظامت معروف شاعرہ اور صحافی ڈاکٹر وسیم راشد نے کی اور اس موقعے پر کونسل کے عملے کے علاوہ زبان وادب سے تعلق رکھنے والے اہم لوگ موجود رہے۔

(پریس ریلیز، رابطہ عامہ سیل، قومی اردو کونسل 14 جون 2022)

یو پی ایس سی ٹاپر شروتی شرما نے اوّل مقام حاصل کیا

سول سروسز 2021 کے لیے یو پی ایس سی (یونین پبلک سروس کمیشن) اس امتحان میں شروتی شرما نے اوّل مقام حاصل کیا ہے۔شروتی شرما نے بات کرتے ہوئے کہا کہ ٹاپ کرنے کی امید نہیں تھی، بس اتنا تھا

کہ کلیئر ہوجائے گا۔لیکن اب خوش ہوں اور ایک راحت بھی ہے کہ پڑھائی پوری ہوئی کیونکہ نصاب میں پڑھنے کے لیے بہت زیادہ تھا اور پڑھائی کرتے وقت ٹائم کا بھی خیال نہیں رکھا۔اب موقع ملا ہے تو خوش ہوں کہ ملک کی خدمت کروں گی۔

شروتی نے دوسری کوشش میں یو پی ایس سی کلیئر کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ان کا کہنا ہے کہ پہلی کوشش میں فارم غلط بھر جانے کی وجہ سے ہندی میں پیپر دینا پڑا تھا اور ایک نمبر سے وہ پیچھے رہ گئی تھیں۔وہ کہتی ہیں ''اس بار انگریزی میں پیپر لکھا اور کلیئر ہوگیا۔پاپا کو جب پتہ لگا تو بہت جذباتی ہوئے۔والدین کی خوشی دیکھ کر ہی مجھے سب سے زیادہ خوشی ہوئی ہے۔''

قابل ذکر ہے کہ یو پی ایس سی امتحان میں انکتا اگروال نامی خاتون امیدوار نے آل انڈیا سیکنڈ رینک حاصل کی ہے۔تیسرا مقام گامنی سنگلا کو ملا اور چوتھے مقام پر بھی ایک خاتون امیدوار ہی ہیں جن کا نام ایشوریہ ورما ہے۔ پانچویں مقام پر اتکرش دویدی ہیں۔لڑکیوں کے بازی مارنے پر شروتی شرما نے کہا کہ لڑکیوں کو ہمیشہ بہتر ماحول نہیں مل پاتا، لیکن اب گاؤں اور شہروں میں والدین اپنی بیٹیوں کی حوصلہ افزائی کرنے لگے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ لڑکیاں آگے بڑھ رہی ہیں۔

واضح رہے کہ یو پی ایس سی ٹاپر شروتی نے دہلی یونیورسٹی کے سینٹ اسٹیفنس کالج اور جواہر لال نہرو یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کی ہے۔ یو پی ایس سی امتحان کی کوچنگ انھوں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے رہائشی کوچنگ اکادمی (آرسی اے) میں لی ہے۔شروتی نے جامعہ کے اساتذہ کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ جامعہ میں آرسی اے کا ایک بڑا تعاون رہا ہے، ایک اچھا ماحول دیا گیا اور اچھے ٹیچرس کا فائدہ ملا۔شروتی کہتی ہیں ''طارق سر اور فاروقی سر نے مجھے بتایا کہ کس طرح پڑھائی کرنی ہے۔''

(30 مئی 2022، قومی آواز، دہلی)

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

شریمد بھگوت گیتا

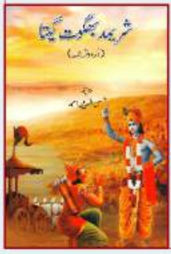

مترجم: حسن الدین احمد

پانچویں طباعت: 2021

صفحات: 105

قیمت 80 روپے

دارا شکوہ: آثار وافکار

ترتیب: شیخ عقیل احمد

پہلی اشاعت: 2021

صفحات: 234

قیمت: 150 روپے

الیکٹرانک اور سوشل میڈیا کے دور میں اردو مصنفین کی ذمہ داریاں

ترتیب: شیخ عقیل احمد

پہلی اشاعت: 2021

صفحات: 182

قیمت: 110 روپے

شاد عظیم آبادی

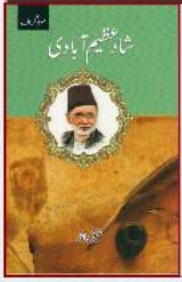

مصنف: عتیق اللہ

پہلی اشاعت: 2022

صفحات: 156

قیمت: 95 روپے

الف لیلہ ولیلہ (جلد اوّل تا ہفتم)

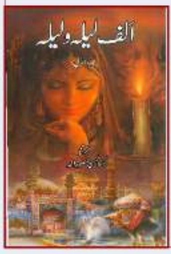

مترجم: ابوالحسن منصور احمد

پہلی اشاعت: 2021

صفحات: 368 (جلد اوّل)، 455 (دوم)
429 (سوم)، 347 (چہارم)، 314 پنجم
313 (ششم)، 223 (ہفتم)

قیمت 1185 روپے (مکمل سیٹ)

اصول طب

مصنف: سید کمال الدین حسین ہمدانی

ساتویں طباعت: 2022

صفحات: 598

قیمت: 160 روپے

کلاسیکی اور عصری سماجیاتی نظریے

مصنف: عذرا عابدی

پہلی اشاعت:: 2021

صفحات: 446

قیمت: 205 روپے

خلجی خاندان

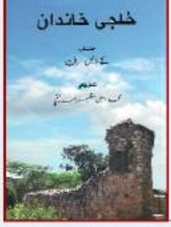

مصنف: کے ایس لال

مترجم: محمد یٰسین مظہر صدیقی

تیسری اشاعت: 2022

صفحات: 481، قیمت: 220 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: books@ncpul.in

माहनामा ख्वातीन दुनिया मासिक, जुलाई-२०२२ वर्ष:६ ,अंक: ७

Mahnama Khawateen Duniya Monthly July 2022, Vol.6 , Issue:7

National Council for Promotion of Urdu Language

Ministry of Education , Department of Higher Education, Government of India

RNI. No. DELURD/2017/74026
DL (S)-17/3555/2021-23
ISSN 2581-4826
Date of Publication: 13-07-2022
Date of Dispatch : 14 and 15 of every month
Total Pages: 64

سوچھ بھارت

ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان و ادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے
مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

منگانے کے لیے رابطہ کریں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159 ، E-mail.: sales@ncpul.in

Printed and Published by Dr. Aquil Ahmad , Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language,
and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 Institutional Area Jasola New Delhi-110025

LPCDELHI,DELHIPSO,DELHIRMS,DELHI-6